بنفشہ کا پھول

جبران خلیل جبران

مترجمہ:

حبیب اشعر دہلوی

بنفشہ کا پھول

جبران خلیل جبران

مترجمہ

حبیب اشعر دہلوی

کتاب خانہ پنجاب لاہور

ملنے کا پتہ

اُردو بک اسٹال لاہور

بار اول ۱۵۰۰ نومبر ۱۹۴۶ء قیمت عہ

روحِ اجمل اعظمؒ کے نام!

ایم۔ ظہیر پرنٹر پبلشر نے گیلانی پریس لاہور سے طبع کرا کر کتاب خانہ پنجاب لاہور سے شائع کیا

فہرست

شاعر اعظم

(۱)

(بعلبک : ۱۱۲ سنہ ق۔م)

بادشاہ تختِ زرنگار پر جلوہ افروز تھا، جس کے چاروں طرف شمعیں اور عود و لوبان کی انگیٹھیاں روشن تھیں۔ دائیں بائیں درباری امیر اور مذہبی پیشوا بیٹھے تھے۔ اور سامنے غلام اور سپاہی اس طرح کھڑے تھے، جیسے سورج کے سامنے مجسمے!

تھوڑی دیر کے بعد، جب مطربوں کے نغمے ختم ہو کر رات کے سیاہ لباس کی تہوں میں گم ہو گئے، تو وزیرِ اعظم اٹھا اور بادشاہ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر، بڑھاپے کی ناتواں آواز میں رک رک کر کہنے لگا:

"جہاں پناہ! ہندوستان کا ایک عجیب و غریب فلسفی کل شہر میں وارد ہوا ہے،

اُس کی تعلیمات ایسی انوکھی ہیں کہ آج تک سننے میں نہیں آئیں۔ اس کا عقیدہ ہے کہ روح ایک جسم سے دوسرے جسم میں اور انسان ایک صدی سے دوسری صدی میں منتقل ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ درجۂ کمال کو پہنچ کر، دیوتاؤں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ اپنے اسی مذہب کی تبلیغ کے لئے وہ یہاں آیا ہے اور چاہتا ہے کہ آج کی رات شرف باریابی حاصل کر کے حضور کے سامنے اپنے عقائد کی وضاحت کرے!"

بادشاہ نے سر ہلایا اور مسکرا کر کہا:

"ہندوستان سے ایسی ہی نرالی چیزیں آتی ہیں۔ اچھا اسے حاضر کرو!! ما بدولت اس کے دلائل سننا چاہتے ہیں۔"

اُسی لمحہ ایک ادھیڑ عمر کا انسان، دربار میں حاضر کیا گیا، جس کا رنگ گندمی، چہرہ پروقار، آنکھیں بڑی بڑی، اور شگفتہ خد و خال، زبان بے زبانی میں، گہرے رازوں اور انوکھی رغبتوں کے ترجمان تھے۔ آداب بجا لانے کے بعد، اجازت پاکر، اُس نے اپنا سر اٹھایا، اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ اپنے نئے عقیدہ کا اظہار کرنے لگا۔ اُس نے بتایا کہ روح اپنے اختیار کردہ درمیانی واسطوں اور حاصل کردہ تجربات کی تاثیرات کے ذریعہ درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے، رفعت و قوت عطا کرنے والی عظمتوں کے ساتھ جھومتے ہوئے اور سعادت و شقاوت سے ہم کنار کرنے والی محبّت کے ساتھ نشو و نما پاتے ہوئے کس طرح ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتی ہے۔ پھر اس نے بیان کیا کہ انسان، کمالیاتی ضرورتوں کی ٹوہ لگاتے ہوئے، دورِ موجود میں عہدِ ماضی

کے گناہوں کا کفارہ ادا کرتے ہوئے، اور ایک جون کی بوئی ہوئی کھیتی دوسری جون میں کاٹتے ہوئے، کس طرح نقل مکان کرتا ہے۔

جب تقریر نے طول کھینچا اور بادشاہ کے چہرے پر بے چینی اور تکان کی علامات ظاہر ہونے لگیں تو وزیر اعظم نووارد فلسفی کے قریب آیا اور اس کے کان میں چپکے سے کہا:

"بس! بحث کو اب کسی اور فرصت کے لئے اٹھا رکھو!!"

فلسفی اُلٹے پاؤں لوٹا اور مذہبی پیشواؤں کی صف میں بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں، گویا ہستی کے رموز و اسرار کو غور سے دیکھتے دیکھتے تھک گیا ہے۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد، جو بیغیرانہ سکر و بے خبری سے مشابہ تھی، بادشاہ نے دائیں بائیں دیکھکر پوچھا:

"ہمارا شاعر کہاں ہے؟ ہم نے اِسے مُدّت سے نہیں دیکھا، اس پر کیا بیتی؟ وہ تو ہر رات ہماری مجلس میں حاضر رہتا تھا۔"

ایک پادری نے عرض کی۔

"ایک ہفتہ گذرا، میں نے اُسے ہیکل عشروت کے آستانے پر بیٹھے دیکھا تھا، وہ اپنی جامد اور غمزدہ نگاہوں سے دور، شفق کو دیکھ رہا تھا، گویا اس کا کوئی قصیدہ بادلوں میں گم ہوگیا ہے!"

ایک درباری بولا:

"کل میں نے اُسے بید اور سرو کے درختوں میں بیٹھے دیکھا تھا، میں نے

سلام کیا، لیکن اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور بدستور اپنے افکار و خیالات کے سمندر میں غرق رہا"

خواجہ سراؤں کے داروغہ نے کہا:

"آج وہ مجھے محل کے باغیچہ میں نظر آیا تھا۔ میں اس کے قریب گئی تو دیکھا رنگت پیلی پڑگئی ہے، چہرہ غم و ملال کی تصویر بنا ہوا ہے، پلکوں پر آنسو مچل رہے ہیں اور سانس گھٹ گھٹ کر آ رہا ہے!"

افسوسناک لہجہ میں بادشاہ نے حکم دیا۔

"جاؤ، اسے فوراً تلاش کر کے لاؤ! امابدولت کی طبع مبارک اس کے لئے بے چین ہے"

غلام اور سپاہی شاعر کی تلاش میں چلے گئے اور بادشاہ سمیت سارا دربار خاموش، حیران اور منتظر بیٹھا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب کمرہ کے وسط میں کھڑے ہوئے ایک غیر مرئی سائے کا وجود محسوس کر رہے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد خواجہ سراؤں کا داروغہ آیا اور بادشاہ کے قدموں پر گر پڑا اُس پرندہ کی طرح، جیسے صیاد کے تیر نے گرا لیا ہو۔ بادشاہ بے اختیار چلّایا:

"کیا بات ہے؟ ——— کیا ہوا؟"

حبشی نے سر اٹھایا اور لرزتے ہوئے کہنے لگا:

"شاعر محل کے باغیچہ میں مردہ پڑا ہے!"

بادشاہ ایک دم کھڑا ہو گیا، اس کا چہرہ رنج و غم سے مرجھا گیا، وہ

آہستہ آہستہ باغ کی طرف چلا، اس طرح کہ آگے آگے غلاموں کے ہاتھوں میں شمعیں تھیں اور پیچھے پیچھے درباری اور پادری، باغ کے احاطہ کے پاس، جہاں بادام اور انار کے درخت ہیں، شمعوں کی زرد شعاعوں کی روشنی میں ایک بے جان جسم دکھائی دیا، جو گلاب کی سوکھی ہوئی ٹہنی کی طرح گھاس میں پڑا تھا۔

ایک درباری نے کہا:

"دیکھنا استار کو کس طرح گلے لگا رکھا ہے، گویا وہ ایک حسین دوشیزہ ہے، جس سے اُسے محبّت تھی اور جو اس سے محبت کرتی تھی اور اسی محبّت کی بنا پر اُنہوں نے عہد کر لیا تھا کہ ہم دونوں ساتھ مریں گے۔"

ایک سپہ سالار بولا:

"حسب عادت اب بھی فضا کی گہرائیوں کو غور سے دیکھ رہا ہے، گویا ستاروں میں اسے انجان خدا کی پرچھائیں نظر آ رہی ہے۔"

کاہنِ اعظم نے بادشاہ سے مخاطب ہوتے ہوئے عرض کی:

"کل ہم اسے مقدس عشتروت کے ہیکل کے سائے میں دفن کریں گے۔ شہر کا ہر چھوٹا بڑا اس کی میت کے ساتھ ہوگا، نوجوان اس کے قصیدے گائیں گے اور نوخیز لڑکیاں اس کے تابوت پر پھول برسائیں گی۔ چونکہ یہ ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر تھا اس لئے اس کی تدفین کا جلوس بھی شاندار ہونا چاہئے۔"

بادشاہ نے شاعر کے چہرے سے نگاہیں ہٹائے بغیر، جس پر موت کی نقاب پڑی تھی، سر ہلایا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا:

"نہیں! جب یہ زندہ تھا اور ملک کے گوشہ گوشہ کو اپنی روح کی تابشوں سے

منور اور فضا کے ذرہ ذرہ کو اپنے سانس کی عطر بیزیوں سے معطر کر رہا تھا، ہم نے اُسے فراموش کر دیا۔ اس لیے اگر ہم اب مرنے کے بعد، اس کی عزت کریں گے تو دیوتا ہمارا مذاق اُڑائیں گے اور وادیوں اور سبزہ زاروں کی پریاں ہم پر ہنسیں گی بہتر یہی ہے کہ اسے یہیں دفن کر دو، جہاں اس کی روح اس کے جسم سے علیحدہ ہوئی ہے، اس کے ستار کو اس کے جسم سے چمٹا رہنے دو! اگر تم میں سے کوئی اس کی عزت کرنی چاہتا ہے تو وہ گھر جائے اور اپنے اہل و عیال کو بتائے کہ بادشاہ نے اپنے شاعر سے بے اعتنائی برتی اور وہ تنہائی و غمگین کے عالم میں مر گیا۔"

اس کے بعد اُس نے چاروں طرف دیکھ کر پوچھا:

"ہندی فیلسوف کہاں ہے؟"

فلسفی آگے بڑھا اور کہا:

"جہاں پناہ! حاضر ہوں!"

بادشاہ نے پوچھا:

"بتا! اے حکیم! کیا دیوتا مجھے ایک بادشاہ اور اُسے ایک شاعر کی حیثیت سے پھر اس دنیا میں بھیجیں گے؟ کیا میری روح کسی شہنشاہ ہفت اقلیم کے ولی عہد اور اس کی روح ایک بڑے شاعر کا قالب اختیار کرے گی؟ کیا قانونِ فطرت اُسے دوبارہ تجلیاتِ الٰہی کی جلوہ گاہ میں حاضر کرے گا؟ تاکہ یہ زندگی کو شعر کا جامہ پہنائے! اور کیا یدی ناموس مجھے پھر اس جہانِ آب و گِل میں بھیجے گا؟ تاکہ میں اس پر اپنے انعام و اکرام کی بارش اور اس کے دل کو اپنی بخشش و عطا سے خوش کروں!"

فلسفی نے جواب دیا:

"روح جو کچھ چاہتی ہے، اُسے ملتا ہے۔ وہ ناموس جو موسم سرما کے خاتمہ پر بہار کی عشرت فروشیوں کو لوٹاتا ہے، ضرور آپ کو باجبروت شہنشاہ اور راستے شاعرِ اعظم بنا کر اس دنیا میں واپس بھیجے گا۔"

بادشاہ کا چہرہ کھل اُٹھا، اُس کی روح میں ایک تازگی — ایک شادابی کروٹیں لینے لگی، اور وہ اپنے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا دماغ، ہندی فیلسوف کے اقوال پر غور کر رہا تھا اور اس کا دل اس کے ان الفاظ کو دہرا رہا تھا "روح جو کچھ چاہتی ہے اُسے ملتا ہے!"

(قاہرہ —— مصر —— سنہ ۱۹۱۲ء)

چاند طلوع ہوا اور اپنی سیمیں چادر شہر پر ڈال دی۔ اس وقت والیٔ سلطنت اپنے محل کے دریچہ میں بیٹھا، صاف ستھری فضا کو دیکھ رہا تھا، اُن قوموں کے آغاز و انجام پر غور کر رہا تھا، جو یکے بعد دیگرے نیل کے کنارے سے گذریں، اُن بادشاہوں اور فاتحوں کے اعمال کا جائزہ لے رہا تھا جو ابوالہول کے دبدبہ و جلال کے سامنے ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے، اور اپنے تصور میں ان قبیلوں اور نسلوں کے جلوس عظمت کا تماشا دیکھ رہا تھا جنہیں زمانہ نے اہرامِ مصر کے اطراف سے نکال کر قصر عابدین میں پہنچا یا۔

جب اس کے افکار کا دائرہ وسیع ہوا اور اس کے خیالات کی نزہت گاہوں میں کشادگی پیدا ہو گئی تو وہ اپنے ندیم کی طرف متوجہ ہوا، جو اس کے قریب بیٹھا تھا اور کہا:

"آج کی رات ابدولت کی خاطر عاطر، شعر و سخن کی طرف مائل ہے اس لئے کچھ سناؤ!"

ندیم نے تعمیل حکم کے لئے سر جھکایا اور عہد جاہلیت کے کسی شاعر کا قصیدہ مترنم آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

"کسی جدید شاعر کا کلام!" بادشاہ نے اُسے روک دیا۔

ندیم نے دوبارہ سر جھکایا اور ایک مخضرمی شاعر کا کلام سنانے لگا۔

"جدید ترین دور کا! جدید ترین دور کا!!" بادشاہ نے پھر روکا۔ ندیم نے تیسری بار پھر سر جھکایا اور موشح اندلسی کے اشعار پڑھنے لگا۔

"کسی ہم عصر شاعر کا قصیدہ سناؤ!" بادشاہ نے حکم دیا۔

ندیم نے اپنی پیشانی پکڑی، گویا شعرائے عصر کے تمام کارناموں کو اپنے حافظہ میں تازہ کر رہا ہے۔ یکایک اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، چہرہ پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ زمانۂ حاضر کے ایک بہت بڑے شاعر کے اشعار ترنم سے پڑھنے لگا، جن میں خیال کی گہرائی، آہنگ کا طلسم، معانی کی باریکی اور اچھوتا پن اور وہ لطیف و نادر کنائے تھے، جو ذہن میں سما کر اسے روشن کردیتے اور دل کے گرد محیط ہو کر اسے شدت جذبات سے پگھلا دیتے ہیں۔

بادشاہ نے ندیم کو غور سے دیکھا۔ اشعار کی معنویت اور خوش آہنگی نے اسے بے قابو کر دیا تھا اور وہ ایک ایسے مخفی ہاتھ کا وجود محسوس کر رہا تھا جو اسے ایک اور ہی عالم ـــــ دور دراز عالم ـــــ کی طرف کھینچ رہے تھے۔ اس نے پوچھا:

"یہ اشعار کس کے ہیں؟"

"بعلبکی شاعر کے!" ندیم نے جواب دیا

بعلبکی شاعر!

بعلبکی شاعر ـــــ دو عجیب و غریب کلمے تھے، جو بادشاہ کے کانوں میں گونجے اور اس کے شفاف ذہن میں ان خواہشوں کی پرچھائیاں چھوڑ گئے

اپنی وضاحت کی بنا پر مبہم اور اپنی باریکیوں کی بنا پر جان دار تھیں۔

بعلبکی شاعر —— ایک نیا پرانا نام، جس نے بادشاہ کے دماغ میں بھولے ہوئے دنوں کے نقوش تازہ کر دئیے، اس کے سینے کی گہرائیوں میں سوئی ہوئی یاد کی پرچھائیوں کو نمایاں کر دیا اور اُن خطوط میں، جو بادلوں کے کناروں سے مشابہ تھے، اُس نوجوان کی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے کھینچ دی، جو سنا کو اپنے گلے سے لگائے مُردہ پڑا تھا اور اس کے چاروں طرف سپہ سالاران افواج پیشوایان مذہب اور امرائے سلطنت کھڑے تھے۔

یہ منظر بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے سے چھُپ گیا، جس طرح خواب، طلوعِ سحر کے وقت روپوش ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ بار بار پیغمبر اسلام کی یہ آیت دہرا رہا تھا:

"تم مردہ تھے، اُس نے تمھیں زندہ کیا۔ اب وہ تمھیں مارے گا، پھر جلائے گا اور تم آخرکار اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے"[1]

اس کے بعد بادشاہ نے ندیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

"ہمارے ملک میں بعلبکی شاعر کا وجود، ہماری خوشی کا سبب ہوا، ہم اس کے پاس جا کر اس کی عزت افزائی کریں گے"

ایک منٹ کے بعد دھیمی ہوتی آواز میں اُس نے پھر کہا۔

"شاعر ایک انوکھا پرندہ ہے، جو عالم قدس کے سبزہ زاروں سے اُڑ کر چہچہاتا ہوا اس دنیا میں آتا ہے۔ اس لئے اگر ہم نے اس کی عزت نہ کی

[1] اس آیت کو مسئلہ تناسخ کی تائید میں پیش کرنا فکر و نظر کی گمراہی ہے (مترجم)

تو وہ پر تولے گا اور پھر اپنے وطن چلا جائے گا۔

رات گزر گئی۔ فضا نے اپنا وہ لباس اُتار دیا جس میں ستارے ٹکے ہوئے تھے اور صبح کی شعاعوں سے بنی ہوئی قمیص پہن لی لیکن بادشاہ کا ذہن اب بھی ہستی کی نیرنگیوں اور زندگی کے اسرار و رموز میں سرگرداں تھا۔

خودکشی سے پہلے

اس ویران و خاموش کمرہ میں، کل وہ عورت بیٹھی تھی، جسے میرا دل
پیار کرتا ہے۔ ان گلابی اور نرم و نازک گاؤ تکیوں پر، اُس کا سر رکھا تھا
اور اس بلوریں شیشہ میں اُس نے عطر آمیز شراب کا ایک قطرہ پیا تھا۔
یہ جو کچھ تھا، کل تھا اور وہ "کل" ایک خواب ہے۔ جو اب کبھی واپس نہیں
سکتا۔

لیکن آج ــــ آج وہ عورت، جو میری اُمیدوں کی دنیا سی۔ ایک
رِ دو ویران اور دور دراز سرزمین کی طرف چلی گئی ہے، جسے تنہائی و فراموشی
لک کہتے ہیں۔

اس عورت کی انگلیوں کے نشانات، جو میرے دل کی ملکہ ہے، اب
تک میرے آئینہ پر نمایاں ہیں، اس کے سانس کی خوشبو سے اب تک میرے
ے مہک رہے ہیں، اور اس کی شیریں آواز سے اب تک میرے مکان
گوشہ گوشہ گونج رہا ہے، لیکن خود وہ عورت ــــ وہ عورت
جو میرے جذبات محبت کا مرکز ہے۔ ایک دور و دراز مقام کی طرف روانہ

ہو گئی ہے، جسے ہجر و فراق کی بستی کہتے ہیں۔ مگر اُس کی اُنگلیوں کے نشانات اس کے دہن کا تعطر اور اس کی روح کی پرچھائیاں اس کمرہ میں کل صبح تک باقی رہیں گی، اور جب ہوا کے لئے، میں اپنے مکان کے دروازے کھولوں تو اس کے جھونکے، ہر اُس چیز کو اُڑا لے جائیں گے، جو اس حسین ساحرہ نے میرے لئے چھوڑی ہے!

اس عورت کی تصویر، جو میری تمناؤں کا سرچشمہ ہے، اب تک میرے بستر کے قریب لٹک رہی ہے محبّت کے وہ خطوط، جو اس نے مجھے لکھے تھے، اب تک عقیق و مرجان سے مرصّع، چاندی کی صندوقچی میں محفوظ ہیں اور اس کی پیشانی کے سنہری بال، جو اس نے اپنی نشانی کے طور پر مجھے دیئے تھے، اب تک مشک و عنبر سے بسے ہوئے غلاف میں رکھے ہیں ـــــ یہ تمام چیزیں صبح تک اپنی جگہ رہیں گی ـــــ لیکن جب صبح ہو گی اور ہوا کے لئے میں اپنے دروازے کھولوں گا، تو اس کی موجیں ان سب چیزوں کو عدم کی تاریکیوں میں لے جائیں گی، جہاں سکون و خاموشی کا دور دورہ ہے۔

نوجوانو! وہ عورت، جس سے میں محبت کرتا ہوں، انہیں عورتوں جیسی ہے، جن سے تم محبّت کرتے ہو، یہ ایک عجیب مخلوق ہے، جسے دیوتاؤں نے کبوتر کی صلح پسندی، سانپ کے پیچ و خم، طاؤس کے غرور و ناز، بھیڑیئے کی کج خلقی، سفید گلاب کے پھول کی رعنائی، اور اندھیری راتوں کے خوف کو، مٹھی بھر راکھ اور چلو بھر سمندر کے جھاگ میں ملا کر بنایا ہے

میں اس عورت کو، جس سے مجھے محبت ہے، بچپن سے جانتا ہوں،

جبکہ میں کھیتوں میں اُس کے پیچھے پیچھے دوڑتا تھا اور بازاروں میں اس کا دامن پکڑ لیتا تھا۔

میں اُسے اپنے عہد نوجوانی میں بھی جانتا تھا، جبکہ میں کتابوں میں اس کے چہرے کا عکس دیکھتا تھا، شام کے بادلوں میں اُس کے قامت کا مشاہدہ کرتا تھا اور نہروں کی روانی میں اُس کی آواز کا ترنم سُنتا تھا۔

میں اُسے اپنی پختہ عمری کے دور میں بھی جانتا تھا، جبکہ میں اُس کے پہلو میں بیٹھ کر اُس سے گفتگو کرتا تھا مختلف چیزوں کے متعلق سوال کرتا تھا، اپنے دل کے درد کی شکائتیں لے کر اُس کے پاس جاتا تھا۔ اور اپنی روح کے اسرار اُس پر ظاہر کرتا تھا۔

یہ جو کچھ تھا، کل تھا اور "کل" ایک خواب ہے، جو اب کبھی واپس نہیں آسکتا لیکن آج ـــــ آج وہ عورت، جسے میرا دل پیار کرتا ہے ایک سرد و ویران اور دور و دراز سرزمین کی طرف چلی گئی ہے، جسے تنہائی و فراموشی کا ملک کہتے ہیں

لیکن اس عورت کا نام کیا ہے،، جسے میرا دل پیار کرتا ہے؟ اس کا نام زندگی ہے!

زندگی ایک حسین و سحر کار عورت ہے، جو ہمارے دلوں کو لبھاتی ہے، ہماری روحوں کو ورغلاتی ہے اور ہمارے ادراک و احساس کو اپنے وعدوں سے گراں بار کرتی ہے، یہ وعدے اگر طول کھینچتے ہیں تو ہم بیں سے جبر

کی قوت جاتی رہتی ہے۔ اور اگر پورے ہو جاتے ہیں تو ہمارے باطن میں رنج والم کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔

زندگی ایک عورت ہے، جو اپنے عاشقوں کے آنسوؤں سے نہاتی اور اپنے شہیدوں کے خون کا عطر ملتی ہے۔

زندگی ایک عورت ہے، جو اُن سفید دنوں کا لباس پہنتی ہے، جن میں سیاہ راتوں کے استر لگے ہیں۔

زندگی ایک عورت ہے، جو قلبِ انسانی کو اپنا دوست تو بنا سکتی ہے لیکن شوہر نہیں بنا سکتی۔

زندگی ایک بدکار مگر حسین عورت ہے۔ جو کوئی اس کی بدکاری دیکھ لیتا ہے اُس کے حسن سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

غلامی

انسان زندگی کا غلام ہے اور یہ غلامی اُس کے دنوں کو ذلّت و خواری کے پردہ میں لپیٹ دیتی اور اس کی راتوں کو اشک و خوں کے سیلاب میں غرق کر دیتی ہے۔

میری پیدائش اوّلین کو سات ہزار برس ہوئے، لیکن آج تک میں نے تسلیم پیشہ غلاموں اور طوق و سلاسل میں جکڑے ہوئے قیدیوں کے سوا کسی کو نہیں دیکھا۔

میں نے دنیا کے مشرق و مغرب کا سفر کیا، زندگی کی تاریکی اور روشنی کے گرد چکر لگائے، قوموں، اور نسلوں کو، گروہ در گروہ غاروں سے نکلکر محلوں میں جاتے دیکھا، لیکن ہنوز بوجھ سے دبی ہوئی گردنوں، زنجیروں میں جکڑی ہوئی کلائیوں اور بتوں کے سامنے جھکے ہوئے گھٹنوں کے سوا اور مجھے کچھ نظر نہ آیا۔

بابل سے پیرس اور نینوا سے نیویارک تک میں انسان کے ساتھ ساتھ رہا، میں نے اس کے نقوش قدم کے برابر، اس کی بیڑیوں کے نشانات، ریگ زار پر مرتسم دیکھے اور وادیوں اور جنگلوں کو زمانہ اور قوموں کے نالہ و ماتم کی صدائیں دہراتے سُنا۔

میں شاہی محلوں، مدرسوں اور عبادت گاہوں میں گیا۔ قربان گاہوں اور مندروں کے سامنے کھڑا ہوا اور دیکھا۔ مزدور تاجر کا غلام ہے، اور تاجر سپاہی کا، سپاہی سپہ سالار کا غلام ہے اور سپہ سالار بادشاہ کا، بادشاہ پادری کا غلام ہے، اور پادری صنم کا، اور صنم مٹی ہے، جسے گوندھکر شیطانوں نے مردہ کھوپڑیوں کے ڈھیر پر نصب کر دیا ہے۔

میں امیروں اور طاقت وروں کی حویلیوں میں داخل ہوا، غریبوں اور کمزوروں کی جھونپڑیوں میں گیا۔ ہاتھی دانت کی تصویروں اور طلائی ساز و سامان سے سجے ہوئے کمروں میں بیٹھا یاس و نومیدی کی پرچھائیوں اور موت کے سانسوں میں مکدّر کوٹھریوں میں ٹھیرا اور دیکھا: بچے دودھ کے ساتھ غلامی کا زہر پی رہے ہیں۔ لڑکے "ا۔ ب ت" کے ساتھ انکسار و خاکساری کا سبق سیکھ رہے ہیں۔ لڑکیاں عاجزی اور وفا بازی کے راستہ لگے ہوئے لباس پہن رہی ہیں اور عورتیں اطاعت و فرمانبرداری کے بستروں میں سو رہی ہیں۔

میں قوموں کے ساتھ ساتھ، گنگ کے کناروں سے، فرات کے ساحل نیل کے دہانہ، سینا کے پہاڑ، ایتھنز کے میدانوں، روم کے کلیساؤں قسطنطنیہ کی گلیوں، پیرس کی سیرگاہوں اور لندن کی عالی شان عمارتوں تک گیا اور دیکھا۔ ہر جگہ غلامی عظمت و جلال کے جلوس کے ساتھ ہے، لوگ اس کی قربان گاہوں پر، نوجوان لڑکوں اور کنواری لڑکیوں کو بھینٹ چڑھاتے ہیں اور اُسے "دیوتا" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اُس کے قدموں میں عطر و شراب بہاتے ہیں۔ اور اُسے "بادشاہ" کا لقب دیتے ہیں، اس کی مورتیوں کے سامنے عود و لوبان سلگاتے ہیں اور اُسے پیغمبر کے نام سے موسوم کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہوئے اُس کے سامنے گرتے ہیں اور اُسے "قانون" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے لئے لڑتے اور ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ اور اس کا نام "وطنیت" رکھتے ہیں۔ خود کو اس کی مرضی کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اور اسے "زمین پر خدا کا سایہ" سمجھتے ہیں، اس

کی ارادت و عقیدت کے جوش میں اپنے مکانوں کو آگ لگاتے اور عمارتوں کو ڈھاتے ہیں اور اُسے "بھائی بندی" اور "مساوات" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی راہ میں جان توڑ کوشش کرتے ہیں اور اسے ملک و تجارت کہتے ہیں۔

بالفاظِ دگر وہ ایک حقیقت ہے اور ایک جوہر، جس کے متعدد نام ہیں اور مختلف مظاہر۔ بلکہ وہ ایک ازلی اور ابدی روگ ہے، جس کے جلو میں مختلف قسم کی بیماریاں اور جراحتیں ہوتی ہیں، جنھیں اولاد روحِ حیات کی طرح اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں پاتی ہے۔ اور جن کے بیج یک زمانہ دوسرے زمانہ کی مٹی میں ڈالتا ہے، جس طرح ایک فصل کے بیج دوسری فصل میں بوئے جاتے ہیں۔

غلامی کی جتنی قسمیں اور صورتیں میں نے دیکھی ہیں، بہت عجیب ہیں۔

اندھی غلامی ـــــ جو انسان کے حال کو اس کے اسلاف کے ماضی سے جکڑ دیتی ہے اور اس کے نفس کو ان کی رواجی پابندیوں کا اسیر کر کے، اُسے پرانی روحوں کے لئے ایک نیا جسم اور بوسیدہ ہڈیوں کے لئے ایک قلعی شدہ قبر بنا دیتی ہے۔

گونگی غلامی ـــــ جو مرد کی زندگی کو اس عورت کے دامن سے باندھ دیتی ہے، جس سے وہ نفرت کرتا ہے اور عورت کے جسم کو اس شوہر کے بستر سے وابستہ کر دیتی ہے، جس سے وہ بیزار ہوتی ہے اور اس طرح ان دونوں کو زندگی کے ایک ایسے رشتہ میں پرو دیتی ہے جو پاؤں اور جوتی کے رشتہ سے مشابہ ہوتا ہے۔

بہری غلامی ــــ جو افراد کو گرد و پیش کے رجحانات کی تقلید اُن کے رنگ میں رنگ جانے اور انھیں کا لباس پہننے پر مجبور کرتی ہے، جس کی وجہ سے وہ عالم اصوات میں صدائے بازگشت اور عالم اجسام میں پرچھائیوں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔

لنگڑی غلامی ــــ جو استقلال و استقامت کے پٹھوں کی گردنوں پر حیلے بازوں کی سیادت کا جوا رکھ دیتی اور اہل ہمت کے ارادوں کو عظمت و شہرت کے لالچیوں کی خواہشوں کے حوالے کر دیتی ہے، جس کی بنا پر وہ اُن آلات کی مثال ہو جاتے ہیں، جنھیں انگلیاں پہلے حرکت دیتی ہیں، پھر ٹھہرا کر توڑ ڈالتی ہیں۔

ادھیڑ غلامی ــ جو بچوں کی روحوں کو وسیع فضا سے سیاہ بختی کے اُن ہر گھروں میں پھینک دیتی ہے، جہاں ضرورت، جہالت کے ہم پہلو مقیم ہوتی ہے، اور ذلت، مایوسی کے جوار میں، اور یہ بچے بدنصیبی کے سایہ میں جوان ہوتے، مجرموں کی طرح زندگی بسر کرتے اور ذلت کے ساتھ مر جاتے ہیں۔

رنگ برنگی غلامی ــــ جو اشیاء کو اُن کی واقعی قیمت ادا کئے بغیر خریدتی اور انھیں ان ناموں سے پکارتی ہے، جو اُن کے اصلی ناموں سے مختلف ــــ بلکہ اُن کی ضد ــــ ہیں، چنانچہ وہ مکاری کو عقل مندی بکواس کو معرفت، کمزوری کو نرم دلی اور بزدلی کو انکار و بے نیازی سے تعبیر کرتی ہے۔

حمیدہ غلامی ——— جو کمزوروں کی زبان کو، خوف و دہشت کے زیرِ اثر جنبش دیتی ہے، چنانچہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں، جنھیں وہ نہیں سمجھتے، ان چیزوں کا اظہار کرتے ہیں، جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں اور بیچارگی کے ہاتھوں میں کپڑے کے اس تھان کی مثال ہو جاتے ہیں، جسے جب چاہو لپیٹ لو اور جب چاہو کھول دو۔

کبڑی غلامی ——— جو ایک قوم کو دوسری قوم کے قوانین کی طرف لے جاتی ہے۔

متعدی غلامی ——— جو شہزادوں کے سر پر حکومت کا تاج رکھتی ہے۔

سیاہ غلامی ——— جو بے خطا مجرموں کی اولاد کو ذلت اور حقارت کے ناموں سے پکارتی ہے۔

اور خود غلامی نتیجہ ہے، اُس غلامی کا، جسے "قوت استمرار" کہتے ہیں۔

جب میں قوموں کی ہمراہی سے تھک گیا اور میری نگاہ نسلوں اور قبیلوں کو دیکھتے دیکھتے اُکتا گئی تو پرچھائیوں کی وادی میں تنہا جا بیٹھا جہاں گذرے ہوئے زمانہ کے سائے روپوش اور آنے والے زمانہ کی روحیں گھات میں بیٹھی تھیں ——— وہاں میں نے دیکھا: ایک نازک سایہ، سورج پر نگاہیں جمائے، تنہا چلا جا رہا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

"تو کون ہے؟ اور تیرا نام کیا ہے؟"

جواب دیا۔

"آزادی!"

میں نے پھر سوال کیا :

"اور تیرے ... بیٹے کہاں ہیں ؟"

"ایک سولی پر چڑھا دیا گیا، دوسرا دیوانہ ہو کر مر گیا اور تیسرا ابھی پیدا نہیں ہوا"

یہ کہا اور کھنڈر کے پیچھے میری نگاہوں سے روپوش ہو گیا۔

پسِ پردہ

جب رات آدھی ہوئی، تو راحیل نے آنکھیں کھولیں، تھوڑی دیر تک چھت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا ، اور پھر بند کر لیں۔ پھر ایک گہرا، مگر ٹوٹتا ہوا ٹھنڈا سانس بھرا، اور ایسی آواز میں، جس سے موت کا شدید کرب ظاہر ہوتا تھا، کہا۔

" جلوس سحر وادی کے کنارے تک پہنچ گیا ہے۔ ہمیں اُسے دیکھنے جانا چاہیئے!"

یہ سُن کر پادری اُس کے قریب آیا اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا ـــ مُردہ کا ہاتھ، برف کی طرح ٹھنڈا تھا، اس کے بعد اُس نے اپنا ہاتھ اُس کے سینے پر رکھا ـــ مُردہ کے دل کی حرکت زمانہ کی طرح خاموش تھی۔

پادری نے اپنا سَر جھکایا اور اُس کے ہونٹ مرتعش ہوئے، گویا اپنی زبان سے ایک مقدس کلمہ ادا کرنا چاہتا تھا، جسے رات کے سائے، اُن سنسان وادیوں میں دہرائیں۔

اب اُس نے اپنی دونوں کلائیوں سے سینہ پر صلیب بنائی اور اُس شخص کی طرف متوجہ ہو کر جو اسی کمرہ کے ایک تاریک گوشہ میں بیٹھا تھا، شفقت و مہربانی کے لہجہ میں کہنے لگا:

"افسوس تمہاری بیوی اللہ کو پیاری ہوئی، اٹھو! اور میرے ساتھ اس کی بخشش کے لئے دعا مانگو"

اس شخص نے اپنا سر اٹھایا، اس کا چہرہ وفور ملال سے متغیر ہو گیا تھا، اور آنکھیں شدت الم سے نکلی پڑ رہی تھیں، وہ خاموشی سے اٹھا اور پادری کے پہلو میں بیٹھکر مرنے والی کے لئے دعائے مغفرت کرنے لگا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اور وہ بار بار اپنے سینے اور چہرہ پر صلیب کا نشان بنا رہا تھا۔

پادری اٹھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا:

"اب تم دوسرے کمرے میں جاؤ! تمھیں نیند اور آرام کی سخت ضرورت ہے!"

وہ بغیر کچھ کہے سنے اٹھا اور سامنے والے کمرہ میں جاکر ایک چھوٹے سے صوفے پر گر گیا۔ غم، بیداری اور انتظار نے اس کے جسم کو بے جان کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ نیند اس کی آنکھوں پر غالب آگئی اور وہ سو گیا، جس طرح ایک شیر خوار بچہ اپنی ماں کی آغوش میں سوتا ہے

لیکن پادری ابھی تک اسی کمرہ کے وسط میں، رنج و ملال کی تصویر بنا کھڑا تھا، وہ بیک وقت اشک آلود آنکھوں سے راحیل کی لاش کو بھی دیکھ رہا تھا اور اس کے شوہر کو بھی، جو سامنے والے کمرہ میں غافل پڑا سو رہا تھا۔

ایک گھنٹہ گذر گیا، جو زمانہ سے زیادہ طویل اور موت سے زیادہ ہولناک تھا۔ مگر پادری سوئے ہوئے مرد، اور سوئی ہوئی عورت کے درمیان اسی طرح کھڑا رہا — مرد جو محبت کی نیند سو رہا تھا اور بہار کی آمد آمد کے خواب دیکھ رہا تھا، اور عورت جو گذرے ہوئے زمانہ کے ساتھ سو رہی تھی، اور ابدیت کے خواب دیکھ رہی تھی۔

اب پادری مُردہ کی چارپائی کے قریب آیا، اور دو زانو بیٹھ گیا۔ جس طرح عبادت گذار قربان گاہ کے سامنے بیٹھتے ہیں، اس نے مُردہ کا ٹھنڈا ہاتھ اُٹھا کر اپنے گرم ہونٹوں سے لگا لیا اور اُس کے چہرے کو دیکھنے لگا جس پر موت کی سیاہ چادر پڑی تھی، رات کی طرح پرسکون، سمندر کی طرح گہری اور انسانی آرزوؤں کی طرح لرزتی کانپتی آواز میں اُس نے کہا:

"راحیل! میری دینی بیٹی راحیل! میری بات سُن!! میں اس وقت گفتگو کرنے پر قادر ہوں، موت نے میرے لب وا کر دیئے ہیں کہ میں تجھ پر وہ راز ظاہر کر دوں، جو خود موت سے زیادہ گہرا ہے اور غم نے میری زبان کے تالے کھول دئیے ہیں، کہ میں تجھ پر وہ راز منکشف کر دوں، جو خود غم سے زیادہ شدید ہے۔

اے زمین اور لامحدود فضا کے درمیان پرواز کرنے والی روح! میری روح کی پکار سُن! اس نوجوان کی پکار سُن!! جو کھیت سے واپس آتے ہوئے تجھے دیکھتا تھا، تو تیرے حسنِ صورت سے مرعوب ہو کر درختوں میں چھپ جاتا تھا، اس پادری کی پکار سُن!!! جو انسان کا قدیم خدمت گذار ہے

خدا کی قسم اَب وہ مجھے، بغیر کسی خوف کے، بلا کر رہا ہے اس لئے کہ تو جوارِ خداوندی میں پہنچ گئی ہے۔"

سرگوشی کے انداز میں یہ الفاظ کہہ کر وہ لاش پر جھک گیا، اور اُس کی پیشانی، آنکھوں اور گردن کی بوسے لینے لگا ——— طویل، گرم اور خاموش بوسے ——— وہ مقدس بوسے، جو اُس کی روح کے اُن تمام اسرار کی پردہ کشائی کر رہے تھے، جن کا تعلق محبت اور غم سے تھا!

اچانک وہ پیچھے ہٹا، اور خزاں زدہ پتہ کی مانند، زمین پر گر پڑا، گویا راحیل کے برفانی چہرہ کے لمس نے جذبۂ ندامت کو اس کے باطن میں بیدار کر دیا تھا۔

وہ اُٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا کر دو زانو بیٹھ گیا۔ دل ہی دل میں اُس نے کہنا شروع کیا:

"یا رب! میرا گناہ معاف کر دے!! میرے معبود! میری کمزوری کو نظر انداز فرما!! میں آخر وقت تک ثابت قدم نہ رہ سکا اور ضبط کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ راز جو سات برس تک زندگی نے میری نگاہوں سے پوشیدہ رکھا، موت نے ایک لمحہ میں مجھ پر واضح کر دیا۔ یا رب میرا گناہ معاف کر دے!! میرے معبود! میری کمزوری کو نظر انداز فرما!!

وہ اسی طرح روتا پیٹتا اور دائیں بائیں سر دھنتا رہا، وہ راحیل

کے مُردہ جسم کی طرف جان بوجھکر نہیں دیکھتا تھا، اس خوف سے کہ کہیں اس کے اسرار نفسانی اس کی روح کو پامال نہ کردیں، یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور اس نے اُن ہیولائی نقوش پر اپنی گلابی چادر ڈالدی، جنھیں محبت، مذہب، زندگی اور موت نے بنایا تھا۔

قیدی بادشاہ

اپنا دل بھاری نہ کر! اے قیدی بادشاہ! تیرا قیدخانہ تیرے لئے
اس قدر ابتلا انگیز نہیں ہے، جس قدر میرا جسم میرے لئے ہے!
صبر کر اور اطمینان سے بیٹھ جا! اے ہیبت و جلال کے پیکر اعظم! مصائب
سے گھبرانا گیدڑوں کا کام ہے۔ لیکن قیدی بادشاہ ہوں گو زنداں
اور داروغۂ زنداں کا مذاق اُڑانے کے سوا، کوئی چیز زیب نہیں دیتی۔
اے عزم و ہمت کے پتلے! اپنا غم ہلکا کر اور میری طرف دیکھ! کہ جس
طرح تو فولادی سلاخوں میں مقید ہے، میں زندگی کے غلاموں میں گھرا
ہوا ہوں، ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں، سوائے اس "خوابِ پریشان" کے
جو میری روح سے متصل ہے۔ لیکن تیرے قریب آتے ڈرتا ہے۔
هم دونوں اپنے اپنے وطن سے نکالے ہوئے ہیں ——
دوستوں اور عزیزوں سے دور! اس لئے پریشان نہ ہو! اور میری
طرح زمانہ کی سختیوں پر صابر ہو کر، ان پست ہمتوں کے ساتھ استہزا کر
جو ہم پر اپنے انفرادی حوصلوں سے نہیں۔ بلکہ اپنی کثرتِ تعداد کی بنا پر

غالب ہیں۔

اسس دہاڑنے اور دڑو کنے سے کیا فائدہ ؟ جبکہ لوگ بہرے ہیں اور نہیں سنتے!

مجھ سے پہلے میں بھی بہت کچھ چیخ پکار کر چکا ہوں، لیکن ظلمت کی پرچھائیں کے سوا کسی نے دھیان نہ دیا۔ تیری طرح میں نے بھی مختلف انسانی جماعتوں کی چھان بین کی ہے، لیکن ان بزدلوں اور کمزوروں کے سوا، مجھے کوئی نہ ملا، جو ازراہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے قیدیوں کے سامنے جھوٹی شجاعت کا اظہار کرتے ہیں، اور پنجرہ نشینوں دانیوں سے بیدردی کے ساتھ گستاخیاں!

دیکھ! اے شاہِ عظمت وجلال! ان لوگوں کی طرف دیکھ! جو تیرے پنجرے کے چاروں طرف کھڑے ہیں۔ دیکھ! ان کے چہروں کو غور سے دیکھ! تجھے ان میں وہ تمام باتیں نظر آئیں گی جو تو گمنام صحراؤں میں اپنے قریب ترین محکوموں اور خادموں کے چہروں پر دیکھتا تھا، ان میں بہت سے اپنی بزدلی کی بنا پر خرگوش، بہت سے اپنی مکاریوں کی وجہ سے لومڑی اور بہت سے اپنی خباثت کے سبب سانپ ہیں، لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں، جس میں خرگوش کی صلح پسندی، لومڑی کی ذہانت، اور سانپ کی دانائی ہو!

دیکھ! اس شخص کو دیکھ! جو اپنی گندگی کی بنا پر خنزیر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، لیکن اس کا گوشت اس قابل نہیں کہ اسے کوئی اپنی غذا،

بنا سکے۔

اب اُس شخص کو دیکھ! جو اپنے روکھے پن کی وجہ سے بھینس کی مثال ہے، لیکن اُس کی کھال کسی کام کی نہیں۔

اب اس شخص کو دیکھ، جو اپنی بے وقوفی کے اعتبار سے گدھا معلوم ہوتا ہے، لیکن دو ٹانگوں سے چلتا ہے۔

اب اُس شخص کو دیکھ! جو نحوست کے لحاظ سے کوا ہے، لیکن اپنی کائیں کائیں کو عبادت گاہوں میں فروخت کرتا ہے۔

اور اب اُس شخص کو دیکھ! جو غرور و ناز میں طاؤس سے مشابہ ہے لیکن اُس کے پر مانگے تانگے کے ہیں۔

دیکھ! اے شاہِ محبت منظر! ان محلوں اور درس گاہوں کو دیکھ یہ چھوٹے چھوٹے گھونسلے ہیں، جن میں انسان رہتا ہے، اور ان طلائی چھتوں پر فخر کرتا ہے، جو اسے ستاروں کے نظارہ سے باز رکھتی ہیں، اُن دیواروں کی پختگی سے خوش ہوتا ہے، جو سورج کی شعاعوں کو اس تک نہیں پہنچنے دیتیں۔

یہ اندھیرے غار ہیں جن کے سائے میں جوانی کے پھول کملا جاتے ہیں، جن کے گوشوں میں محبت کے دہکتے ہوئے انگارے راکھ ہو جاتے ہیں اور جن کی فضا میں تصورات کے سارے نقوش، دھوئیں کے ستونوں سے بدل جاتے ہیں۔

یہ انوکھی وضع کے تہ خانے ہیں، جن میں بچے کی پلنگڑی مرنے

والے کے بستر کے ہم پہلو ہوتی ہے اور رودھن کا چھپر کھٹ مردہ لاشوں کے قریب!

دیکھ! اے جلیل الشان قیدی! ان چوڑے چکلے بازاروں اور ان تنگ وتاریک گلیوں کو دیکھ! یہ وادیاں ہیں، جن کی راہیں دشوار گذار ہیں، جن کے گڑھوں میں چور تاک لگائے بیٹھے ہیں۔ اور جن کے کناروں پر باغی چھپے ہوئے ہیں۔

یہ خواہشوں کے میدان جنگ ہیں ـــ اُن خواہشوں کے میدان جنگ، جن میں روحیں بغیر تلوار کے لڑتی اور بغیر دانتوں کے ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی اُترتی ہیں۔

بلکہ یہ خوفناک جنگل ہیں، جن میں انسانی صورتوں، خوشبو میں بسی ہوئی دُموں اور چمکدار سینگوں والے جانور رہتے ہیں، جو قانون اس لئے نافذ نہیں کرتے کہ محاسنِ حیات کی حفاظت کریں۔ بلکہ اس لئے جاری کرتے ہیں کہ مکاریوں اور چالبازیوں کو استحکام ودوام حاصل ہو۔ اور جن کے رواجی ضابطے بہتر اور جاندار چیزوں کی بقا کے نہیں۔ جھوٹ اور بدکاری کی بقا کے ضامن ہوتے ہیں۔ رہے ان کے بادشاہ سو وہ تیری طرح شیر نہیں، بلکہ ایک عجیب وغریب مخلوق ہیں جن کی چونچیں گِدھوں کی سی ہیں اور چنگل بجوؤں کے سے، زبانیں سانپوں کی سی ہیں اور ٹرٹر مینڈکوں کی سی۔

میری جان تجھ پر نثار! اے قیدی بادشاہ! میری گفتگو بہت طویل ہو گئی۔ اور میں نے تیرا بہت سا وقت ضائع کر دیا۔ لیکن اپنے مرتبہ سے گرا ہوا دل تخت سے اُتارے ہوئے بادشاہوں سے ہی تسلّی حاصل کرتا ہے، اور غمگین و مقیّد روح، قیدیوں اور غم زدوں ہی سے مانوس ہوتی ہے۔

اس لئے اس نوجوان کو معاف فرما، جو اپنی بھوک کو کھانے کی بجائے باتوں سے بہلا رہا ہے، اور پیاس کو پانی کی بجائے تصورات سے!

اے قہرمانِ اعظم! رخصت! اگر ہم اس دنیا میں دوبارہ نہ مِل سکے تو پرچھائیوں کی دُنیا میں ملیں گے۔ جہاں بادشاہوں کی روحیں، شاعروں کی روحوں سے ملتی ہیں۔

بڑا دن

آج ـــ اور ہر سال آج کے دن، انسانیت اپنی گہری نیند سے بیدار ہوکر قوموں کی پرچھائیوں کے سامنے کھڑی ہوتی ہے اور مسیح ناصری کو سولی پر لٹکا ہوا دیکھنے کے لئے اپنی آنکھوں ـــ اشک آلود آنکھوں ـ کا مرکز، کوہ جلجلہ کو بنالیتی ہے، اور جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو واپس ہوتی ہے، اور اُن بتوں کے سامنے سجدہ میں گر پڑتی ہے، جو پہاڑ کے دامن یا چوٹیوں پر نصب ہیں۔

آج ایک تصوّر عیسائیوں کو دنیا کے گوشہ گوشہ سے کھینچکر، بیت المقدّس میں پہنچا دیتا ہے، جہاں وہ صف باندھ کر کھڑے ہوتے اور اُس تصویر کو دیکھ دیکھکر اپنا سینہ کوٹتے ہیں۔ جو سر پر کانٹوں کا تاج رکھے اور آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے، موت کے پردہ سے زندگی کی گہرائیوں کو دیکھ رہی ہے ...... لیکن ابھی دن کے مناظر پر، رات اپنے سیاہ پردے ڈالنے بھی نہیں پاتی کہ وہ لوٹتے ہیں اور جہالت ویلے حسی کے لحافوں میں، نسیان و فراموشی کے زیر سایہ، سوجاتے ہیں۔

ہر سال آج کے دن، فلسفی اپنے تنگ و تاریک غاروں، مفکر اپنے بے کیف حجروں، اور شاعر اپنی خیالی وادیوں کو چھوڑ کر ایک بلند پہاڑ پر خاموش و مرعوب جا کھڑے ہوتے ہیں اور اس مردِ بزرگ کی آواز پر کان لگا دیتے ہیں، جو اپنے قاتلوں کے متعلق کہتا ہے:

"اے مقدس باپ! انہیں معاف کر دے کہ یہ نہیں جانتے، ہم کیا کر رہے ہیں؟!"

لیکن خاموشی، روشنی کی آوازوں کو لپیٹنے بھی نہیں پاتی کہ وہ سب کے سب اپنی روحوں کو پرانی کتابوں کے اوراق میں کفنا دیتے ہیں۔

زندگی کی مادی مسرتوں اور زیور و لباس پر جان دینے والی عورتیں آج اپنے گھروں سے نکلتی ہیں، اس غمگین عورت کو دیکھنے کے لئے، جو صلیب کے سامنے اس طرح کھڑی ہے، جیسے سرمائی آندھیوں کے سامنے نرم و نازک پودا، اور اس کی گہری آہوں اور الم ناک سسکیوں کو سننے کے لئے اس کے پاس جاتی ہیں۔

زمانہ کی رو کے ساتھ بہنے والے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جنہیں مطلق علم نہیں کہ ہم کس طرف بہ رہے ہیں؟ آج کے دن تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاتے ہیں اور اس نوجوان عورت — مریم مجدلیہ — کو مڑ کر دیکھتے ہیں جو زمین و آسمان کے درمیان کھڑے ہوئے مرد کے پاؤں کا خون اپنے آنسوؤں سے دھوتی ہے۔ لیکن جب ان کی نگاہیں اس منظر کو دیکھتے دیکھتے اکتا جاتی ہیں تو ہنستے ہوئے تیزی سے بھاگ جاتے ہیں۔

ہر سال آج کے دن، انسانیت، بہار کی بیداری کے ساتھ جاگتی ہے اور مسیحؑ کی تکلیفوں پر روتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے، اس کے بعد اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے اور پھر گہری نیند سو جاتی ہے، لیکن بہار بیدار رہتی ہے، اور ایک خوشگوار تبسم کے ساتھ مصروفِ گلگشت، یہاں تک کہ موسم گرما سے بدلجاتی ہے جس کا لباس زریں ہوتا ہے اور دامن معطر۔

انسانیت وہ عورت ہے، جو عظیم ترین شخصیتوں پر ماتم کرنے اور رونے پیٹنے سے خوش ہوتی ہے! لیکن اگر وہ مرد ہوتی تو اُن کی عظمت و جلالت سے مسرور رہتی۔

انسانیت ایک بچہ ہے، جو ذبح شدہ پرندے کے پاس کھڑے ہوکر، چیخ! پکار مچاتا ہے، لیکن اس خوفناک آندھی سے لرزہ براندام ہوتا ہے جو اپنے جھونکوں سے خشک ٹہنیوں کو توڑ ڈالتی اور بدبودار نجاستوں کو اڑا لیجاتی ہے۔

انسانیت مسیحؑ ناصری کو فقیروں کی طرح پیدا ہوتے، مسکینوں کی طرح زندگی بسر کرتے، کمزوروں کی طرح تکلیف اُٹھاتے اور مجرموں کی طرح سولی چڑھتے دیکھتی ہے اور روتی ہے، واویلا مچاتی ہے، نوحہ و ماتم کرتی ہے، اور یہ سب کچھ مسیح کی عزت و تکریم کے لئے ہوتا ہے۔

اُنیس سو برس سے انسان مسیحؑ کی شکل میں کمزوری کو پوج رہا ہے، حالانکہ مسیحؑ قوی تھا، لیکن حقیقی قوت کے مفہوم سے دنیا ناواقف ہے۔

مسیحؑ نے خوف و مسکینی کی زندگی بسر کی نہ درد و شکایت کے عالم میں مرا،

بلکہ انقلابیوں کی طرح زندگی گذاری، باغیوں کی طرح سولی چڑھا، اور اہل ہمت کی طرح موت کو لبیک کہا۔

مسیحؑ شکستہ پر طائر نہیں، پرجوش آندھی تھا، جس نے اپنے تند و تیز جھونکوں سے تمام خمیدہ بازوؤں کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔

مسیحؑ فضائے نیلگوں سے غم کو زندگی کی رمز بنانے کے لئے نہیں زندگی کو حق و آزادی کی رمز بنانے آیا تھا۔

مسیحؑ نہ تو اپنے دشمنوں اور ظالموں سے خائف تھا اور نہ اپنے قاتلوں سے۔ دردناک بلکہ وہ ایک کھلا ہوا حریت پسند تھا، جس نے ظلم و استبداد کا جرأت سے مقابلہ کیا، جہاں کہیں مکروہ پھوڑا دیکھا نشتر لگایا، جہاں کہیں شر کو بولتے سُنا، گونگا کر دیا، اور جہاں کہیں ریاکاری کو پایا فنا کے گھاٹ اُتار دیا۔

مسیحؑ نور کے اُس بلند دائرہ سے اس لئے نہیں اُترا تھا کہ مکانوں کو ڈھا کر اُن کی اینٹوں سے خانقاہیں اور عبادت کدے تعمیر کرے یا طاقت وروں کو بُھاکر کہانت و رہبانیت کی طرف ان کی رہنمائی کرے، بلکہ وہ فضاء عالم میں ایک جدید اور قوی روح پھونکنے اُترا تھا، جو مردہ کھوپریوں کے ڈھیر پر رکھے ہوئے تختوں کو مسمار کر دیتی ہے، قبروں پر بنے ہوئے بلند و عالی شان محلوں کو ڈھاتی ہے اور مسکین و کمزور جسموں پر نصب شدہ بتوں کو پاش پاش کر ڈالتی ہے۔

مسیحؑ لوگوں کو اس بات کی تعلیم دینے نہیں آیا تھا کہ وہ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں اور سرد و تاریک مکانوں کے پہلوؤں میں بلند و بالا عبادت گاہوں اور عالیشان کلیساؤں کی بنیاد رکھیں، بلکہ اس لئے آیا تھا کہ انسان کے دل کو کلیسا، اُس کی

روح کو قربان گاہ اور اُس کی عقل کو پادری بنائیے!

یہ ہیں وہ کارنامے جو مسیح کی ذات سے ظہور میں آئے۔ اور یہ ہے وہ تعلیم، جس کی وجہ سے اُسے پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اگر انسان اِن نکتوں کو سمجھتا تو آج کے دن خوشیاں مناتا اور فتح و نصرت کے گیت گاتا۔

اور تو، اے صاحبِ عظمت و جلال مصلوب! جو گلجلہ کی بلندیوں۔ مختلف نسلوں کو دیکھ رہا ہے، قوموں کی چیخ پکار سُن رہا ہے، اور ابدیت کے خوابوں کی حقیقت سمجھ رہا ہے، تو خون میں لتھڑی ہوئی صلیب پر، ہزار سلطنتوں کے ہزار تختوں پر، ہزار ہا بادشاہوں سے زیادہ ہیبت و جلال رکھتا ہے، جاں کنی اور موت کے درمیان، ہزار معرکوں کی ہزار فوجوں کے ہزار سپہ سالاروں سے زیادہ بہادر اور باوقار ہے!

تو اپنے غم میں بھی گل آفریں بہار سے زیادہ مسرور ہے، تیرا دل درد کی شدت کے باوصف فرشتوں کے دل سے زیادہ پُرسکون ہے، اور تو جلادوں میں گھرا ہوا ہونے کے باوجود سورج کی کرنوں سے زیادہ آزاد ہے!

یہ کانٹوں کا تاج، جو تیرے سر پر رکھا ہے، بہرام کے تاج سے زیادہ حسین اور قیمتی ہے، یہ میخیں جو تیری ہتھیلیوں میں ٹھکی ہوئی ہیں، جو گان مشتری سے زیادہ قدر و مرتبہ رکھتی ہیں، اور خون کے یہ قطرے جو تیرے قدموں پر منجمد ہیں عشتروت کی مالاؤں سے زیادہ چمکدار ہیں۔

ان کمزوروں سے باز پرس نہ کر! جو تجھ پر محض اس لئے ماتم کرتے ہیں کہ اپنی روحوں پر ماتم کرنا نہیں جانتے، خدارا انہیں معاف فرما کہ انہیں علم نہیں، تو موت کے لئے موت سے لڑا اور مردوں کو زندگی عطا فرما گیا۔

رنگے ہوئے گیدڑ

(۱)

سلمان آفندی

پینتیس سالہ مرد ــــ خوش پوشاک، خوش قامت، چڑھی ہوئی مونچھیں پاؤں میں چمک دار جوتا اور ریشمیں جرابیں، منہ میں قیمتی سگریٹ، اور ہاتھ میں حسین و نازک بیت، جس کی سنہری موٹھ، اعلیٰ درجہ کے جواہر سے مرصع، عالی شان ہوٹلوں میں کھانا کھاتا ہے، جہاں شہر کے بڑے بڑے لوگ جمع ہوتے ہیں اور شاندار گاڑی میں مشہور تفریحی مقامات کی سیر کو جاتا ہے، جسے دو نہایت نفیس گھوڑے کھینچتے ہیں۔

سلمان آفندی کو اپنے باپ سے ایک کوڑی ورثہ میں نہیں ملی۔ اللہ بخشے اس کا باپ ایک غریب اور مفلس آدمی تھا، جس نے کبھی تجارت کی نہ دولت کمائی، وہ حد درجہ سست اور کاہل تھا، کام سے نفرت کرتا اور اسے اپنے مرتبہ سے گری ہوئی چیز سمجھتا، ہم نے ایک مرتبہ خود اس کی زبان سے سنا ہے کہ

"میرا جسم اور میری فطرت کام سے میل نہیں کھاتی، کام ان لوگوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے، جن کی فطرت بے کیف اور جسم کھردرے ہیں"

تو پھر سلمان آفندی نے اتنی دولت کہاں سے حاصل کی اور وہ کونسا جادوگر تھا جس نے مٹی کو اس کی مٹھیوں میں سونے چاندی سے بدل دیا؟

یہ رنگے ہوئے گیدڑوں کے بے شمار رازوں میں سے ایک راز ہے جو عزرائیل نے ہمیں بتایا اور اب ہم تمہیں بتاتے ہیں:

پانچ برس ہوئے ہیں کہ سلمان آفندی نے سیدہ فہیمہ سے شادی کی سیدہ فہیمہ، مرحوم پیٹرس نعمان تاجر کی بیوہ ہے، جو اپنی کوشش استقلال اور دیانت کے لئے اپنے تمام ہمسروں میں شہرت رکھتا تھا، اس وقت سیدہ فہیمہ کی عمر پینتالیس ۴۵ سال ہے اور اس کے جذبات کی عمر سولہ ۱۶ سال، وہ ہر چند اپنے بالوں میں اور آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہے، اپنے چہرہ کو کریم اور پاؤڈر سے چمکاتی ہے، لیکن سلمان آفندی آدھی رات سے پہلے کبھی گھر میں نہیں گھستا، شاید ہی کوئی گھڑی ہوتی ہو، جب وہ اپنے شوہر کی تیز تیز نشتروں اور نا ملائم کلمات سے محفوظ رہتی ہو، جس کی وجہ یہ ہے کہ سلمان آفندی نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں اور اس دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے، جو اس کے پہلے شوہر نے خون پسینہ ایک کرکے جمع کی تھی۔

(۲)

ادیب آفندی

ستائیس سالہ جوان — لمبی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ناپاک چہرہ ہاتھ روشنائی میں بھرے ہوئے، ناخن میل سے اٹے ہوئے جسم پر

پھٹے پرانے کپڑے جن پر جا بجا تیل، چکنائی اور قہوے کے چلتے۔

اس مکروہ حالت کا سبب، ادیب آفندی کی غربت و محتاجی نہیں، غفلت و بے پروائی ہے، وہ مصروفیت ہے، جس نے بلند مسائل، معنوی امور اور الہیاتی مباحث کی تحقیق و تلاش کے سلسلہ میں اس کے دماغ کو گھیر رکھا ہے، چنانچہ ہم نے خود اُسے امین جندی سے کہتے سنا ہے کہ

"طبیعت دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتی"

یعنی ادیب ایک وقت میں انشا پردازی اور پاکیزگی، دونوں کا خیال نہیں رکھ سکتا۔

ادیب آفندی بہت بولتا ہے اور ہر وقت بولتا ہے۔ اس کے نزدیک بولنا دنیا کی ہر چیز سے افضل ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس نے بیروت کے کسی مدرسہ میں دو سال تک ایک مشہور اُستاد سے علم بدیع کا درس لیا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس نے بہت سی نظمیں کہی ہیں، مضامین لکھے ہیں اور کتابیں مرتب کی ہیں، جو مختلف اسباب کی بنا پر، جن میں سب سے بڑا سبب عربی صحافت کا انحطاط اور پڑھنے والوں کی جہالت ہے، ہنوز طبع و اشاعت سے محروم ہیں۔

کچھ دنوں سے ادیب آفندی اپنی توجہ قدیم و جدید فلسفہ کی باریکیوں پر صرف کر رہا ہے؛ وہ ایک ہی وقت میں سقراط کا بھی عقیدتمند ہے اور نیٹشے کا بھی۔ وہ اگسٹس کے ملفوظات بھی اسی شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہے جس شوق و دلچسپی کے ساتھ والٹیر اور ژان ژاک روسو کی کتابیں

ہم پہلی مرتبہ اس سے ایک شادی میں ملے تھے، لوگ اس کے چاروں طرف، نغمہ و شراب میں مست تھے اور وہ اپنے مشہور بلیغ انداز میں شکسپیر کے ڈرامہ ہملٹ پر تبصرہ کر رہا تھا۔

دوسری مرتبہ ہم نے اُسے ایک رئیس کے جنازہ میں دیکھا، لوگ اس کے ہم پہلو، غمگین چہرے بنائے، سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور وہ اپنی مخصوص فصیح البیانی کے ساتھ فارض کی غزلوں اور ابونواس کی خمریات پر بحث کر رہا تھا۔

اِن حالات میں ادیب آفندی کیوں جی رہا ہے، پرانی کتابوں اور بوسیدہ اوراق میں اپنے شب و روز برباد کرنے سے اس کا کیا مقصد ہے، وہ ایک گدھا کیوں نہیں خرید لیتا اور اُسے کرایہ پر چلا کر دولتمند کرایہ خواروں کی صف میں شامل کیوں نہیں ہو جاتا!

یہ رینگتے ہوئے گبریڑوں کے بے شمار رازوں میں سے ایک راز ہے جو بعلزبول نے ہمیں بتایا اور ہم اب تمہیں بتاتے ہیں؟

تین برس ہوئے کہ ادیب آفندی نے پادری یوحنا شمعون کی شان میں ایک قصیدہ لکھا اور حبیب بک سلوان کے گھر میں اس کے سامنے پڑھا؛ قصیدہ ختم ہو جانے کے بعد پادری نے اُسے بُلایا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا:

"بیٹا! خدا تجھے زندہ و سلامت رکھے! تو بڑا نکتہ رس شاعر اور فطرت شناس ادیب ہے، میں تجھ جیسے باکمالوں پر فخر کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے

کہ تو ایک دن مشرق کی بڑی شخصیتوں میں شمار کیا جائے گا؟"

اُس دن سے لیکر آج تک ادیب آفندی اپنے باپ، چچا اور ماموں کی تحسین و ستائش کا مرکز ہے۔ وہ فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

"کیا پادری یوحنا شمعون نے ارشاد نہیں فرمایا تھا کہ وہ ایک دن مشرق کی بڑی شخصیتوں میں شمار کیا جائے گا؟"

(۳)

فرید دعیبس

چالیس سال کا پختہ عمر انسان ــــ لمبا قد، چھوٹا سا سر، بڑا دہانہ، تنگ پیشانی، اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ، سینہ نکال کر آہستہ آہستہ چلتا ہے، اس کی رفتار اس اونٹ کی رفتار سے متوازن ہے، جس کی پیٹھ پر محمل ہو، جب وہ بلند آواز اور پر وقار آواز میں گفتگو کرتا ہے تو انجان آدمی یہ سمجھتا ہے کہ حکومت کا کوئی وزیر لوگوں کے معاملات سدھارنے اور رعایا کی تکلیفیں دور کرنے میں مصروف ہے۔

فرید بک کو اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ محفلوں میں صدر مقام پر بیٹھے اور اپنے بزرگ خاندان کے کارنامے گنوائے یا اپنی عالی نسبی کی خصوصیات بیان کرے۔ وہ نپولین اور عنتر عبسی جیسے بہادروں اور بڑے لوگوں کے حالات اور کارنامے بہت دلچسپی سے سنتا ہے نفیس اسلحہ جمع کرنے کا اُسے خاص شوق ہے اور وہ اس کے گھر کی دیواروں پر ترتیب سے چنے ہوئے بھی ہیں۔ لیکن وہ ان کو استعمال کرنا نہیں جانتا۔

اُس کا قول ہے کہ

"اللہ نے انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے، ایک گروہ خدمت کرنے کے لئے ہے اور دوسرا گروہ خدمت لینے کے لئے"

اس کا دوسرا قول ہے کہ

"خاندان ایک اڑیل ٹٹو ہے، جو اس وقت تک نہیں چلتا، جب تک کوئی اس کی پیٹھ پر سوار نہ ہو جائے"

یہ تیسرا قول بھی اسی سے منسوب ہے کہ

"قلم کمزوروں کے لئے ہے اور تلوار قوت والوں کے لئے"

اچھا تو وہ اسباب کیا ہیں؟ جن کی بنا پر فرید بک اپنی بڑائی کے لئے شیخیاں مارتا ہے؟ از راہ غرور اپنی عالی نسبی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے، اور خود بینی و خود پسندی کا اظہار کر کے لوگوں پر اپنی فوقیت جتاتا ہے۔

یہ رنگے ہوئے گیدڑوں کے بے شمار رازوں میں سے ایک راز ہے جو سطنائیل نے ہمیں بتایا اور ہم اب نہیں بتاتے ہیں۔

اُنیسویں صدی کے ثلث اوّل میں سلطان بشیر شہابی اپنے امیروں کے ساتھ لبنان کی وادیوں میں سیر و تفریح کے لئے آیا، اتفاق کی بات جب وہ اس گاؤں کے قریب سے گذرا جس میں فرید بک دعیس کا دادا منصور بک دعیس رہتا تھا تو دھوپ تیز ہو گئی اور سورج کی باریک باریک کرنیں زمین کا سینہ چھیدنے لگیں۔ سلطان گرمی کی تاب نہ لا کر گھوڑے سے اتر پڑا اور ساتھیوں سے کہا:

"آؤ! تھوڑی دیر اس بلوط کے سائے میں دم لے لیں!!"

جب منصور و عیبس کو اس کا علم ہوا تو اس نے اپنے ہمسایہ کسانوں کو بلایا اور انہیں خبر دی کہ سلطان اُن کے گاؤں کے قریب رونق افروز ہے، یہ سُن کر وہ سب کے سب انجیر اور انگور کے خوان اور دودھ شراب اور شہد کی مٹکیاں لئے منصور کے پیچھے پیچھے بلوط کے درخت کی طرف چلے جہاں سلطان لبشیر شہابی قیام فرما تھا، منزل مقصود پر پہنچکر، منصور عیبس آگے بڑھا اور عبائے شاہی کو بوسہ دیا، پھر اس کے قدموں میں ایک بکرا ذبح کیا اور بلند آواز میں کہا:

"یہ سب جہاں پناہ کے مراحم خسروانہ کا اثر ہے!"

سلطان نے اظہار خوشنودی کے طور پر اُسے خلعت عطا فرمایا اور کہا:

"تم آج سے اس گاؤں کے سردار ہو، جسے ہماری خصوصی عنایتیں نوازتی رہیں گی، جاؤ! ہم بدولت نے تمہارے گاؤں والوں پر اس سال قناری ٹیکس معاف فرما دیا۔"

امیر کے چلے جانے کے بعد، اس رات کو گاؤں کے تمام آدمی سردار منصور عیبس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُسے اپنے رنج و راحت کا آقا تسلیم کر لیا۔ اللہ ان سب پر رحم کرے!

رنگے ہوئے گیدڑوں کے اور بھی بہت سے راز ہیں جن سے شیطان

ہمیں دن رات آگاہ کرتے رہتے ہیں اور ہم اس سے پہلے کہ زمانہ ہمیں فضائے نیلگوں کے اس پار پہنچا دے، تمہیں ان سے آگاہ کریں گے۔ لیکن اس وقت، رات آدھی ہو چکی ہے اور بیداری نے ہماری پلکوں کو تھکا دیا ہے۔ اس لئے ہمیں سونے کی اجازت دو، بہت ممکن ہے خوابوں کی پری ہماری روح کو اُس عالم میں لے جائے، جو اس عالم سے کہیں زیادہ پاک و صاف ہے۔

پری

تو مجھے کہاں کھینچے لئے جارہی ہے، اے ساحرہ!

میں کہاں تک ان پرخار و ناہموار چٹانی راہوں پر تیرے ساتھ چلوں جو ہمارے قدموں کو تو بلندی کی طرف لے جارہی ہیں، لیکن ہماری روحوں کو پستی کی طرف دھکیل رہی ہیں!

میں نے تیرا دامن پکڑا، اور اس بچہ کی طرح، جو ہر وقت اپنی ماں سے چمٹا رہتا ہے، تیرے ساتھ ہولیا، میں نے اپنے تمام تصورات کو بھلاکر، تیرے حسن پر نگاہیں جما دیں، اور اپنے سر کے گرد منڈلاتی ہوئی پرچھائیوں کی طرف سے آنکھیں بند کرکے، اس مقناطیسی قوت کی طرف کھنچ گیا، جو تیرے جسم میں پوشیدہ ہے!

تھوڑی دیر کے لئے ٹھیر جا، کہ میں تیری صورت دیکھ لوں، بس ایک نظر مجھ پر ڈالدے کہ بہت ممکن ہے، میں تیری آنکھوں میں تیرے دل کے بھید پالوں، اور تیرے خد و خال سے تیری روح کی باریکیوں کو سمجھ لوں!!

ذرا کی ذرا ٹھیر جا! اے پری! کہ میں چلتے چلتے تھک گیا ہوں اور میری

روح راستہ کی خوفناکیوں سے تھرا رہی ہے!! ٹھیرا کہ ہم اُس دوراہے پر پہنچ گئے ہیں، جہاں موت، زندگی سے ہمکنار ہے، اب میں ایک قدم آگے نہ بڑھاؤں گا، جب تک میری روح، تیری روح کے ارادوں سے واقف، اور میرا دل تیرے دل کے بھیدوں سے آشنا ہو جائے گا۔

میری سُن! اے طلسم کاری پری!

کل تک میں ایک آزاد پرندہ تھا، جو دن بھر نہروں پر منڈلاتا اور فضا میں اُڑتا تھا، اور شام ہوتے، کسی شاخ پر بیٹھ کر، رنگا رنگ بادلوں کی بستی میں ان محلوں اور عبادتگاہوں کا نظارہ کرتا تھا جنھیں سورج سہ پہر کو بناتا اور غروب ہوتے وقت ڈھا دیتا ہے!

بلکہ میں ایک خیال تھا، جو زندگی کی خوبیوں اور لذتوں سے مسرور ہوتے ہوئے اور ہستی کے اسرار و رموز کا کھوج لگاتے ہوئے، دُنیا کے مشرق و مغرب کا تنہا چکر لگاتا تھا۔

نہیں! بلکہ ایک خواب تھا، جو رات کے پردوں پر، کھڑکیوں کی درزوں میں سے داخل ہوتا اور سوتی ہوئی حسین اچھوتیوں کی خوابگاہ میں اُن کے جذبات سے کھیلتا تھا، نوجوانوں کی مسہریوں کے پہلو میں کھڑے ہو کر اُن کی آرزوؤں کو بھڑکاتا تھا۔ اور بوڑھوں کے بستر کے پاس بیٹھکر اُن کے خیالات کی ٹوہ لگاتا تھا۔

لیکن آج، جبکہ اے ساحرہ، میں تجھ سے مل چکا ہوں اور تیرے ہاتھوں کے بوسے نے میری ہر رگ اور ہر ریشہ میں زہر کی سی تلخی پیدا کردی ہے۔

اُس قیدی کی مثال ہو گیا ہوں جو زنجیروں میں جکڑا ہو، نہ معلوم کہاں جا رہا ہے؟ بلکہ اُس مخمور کی مثال ہو گیا ہوں جو مئے ہوشربا کے جام پر جام چڑھا رہا ہو اور ان ہاتھوں کو بوسہ دے رہا ہو جنھوں نے اُس کے چہرہ پر طمانچہ مارا ہے۔

لیکن اے ساحرہ! ذرا ٹھیر اور دیکھ کہ میں نے اپنی تمام قوتیں واپس لے لی ہیں، اُن زنجیروں کو توڑ دیا ہے، جو میرے پاؤں میں پڑی تھیں، اور اُس پیالہ کو چور چور کر دیا ہے، جس میں میں نے خوشگوار —— اپنی دانست میں خوشگوار —— زہر پیا تھا! بتا! اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ کس راستہ پر چلنا چاہیئے

میں پھر آزاد ہو گیا ہوں! کیا اب تو مجھے اپنا آزاد رفیق بنانے پر راضی ہے؟ جو سورج کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا ہے اور رعشہ سے نا آشنا انگلیوں سے دہکتے ہوئے انگاروں کو پکڑ لیتا ہے!

میرے بازو پھر کھل گئے ہیں! کیا اب تو اس نوجوان کے ساتھ رہنے پر تیار رہے؟ جو اپنے دن عقاب کی طرح، پہاڑوں میں گذارتا ہے، اور راتیں شیر کی طرح جنگلوں میں!

کیا اب تو اس مرد کے شوق کو کافی سمجھتی ہے؟ جو محبت کو اپنا دم ساز تو بنا سکتا ہے، لیکن پیشوا نہیں بنا سکتا!!

کیا اب تو اُس دل کی محبت پر قناعت کرتی ہے؟ جو آرزومند تو ہو سکتا ہے، لیکن اطاعت نہیں کر سکتا! بھڑک تو سکتا ہے لیکن پگھل نہیں سکتا"

کیا اب تو اُن تمناؤں پر اعتماد کرتی ہے جو آندھی کے سامنے کانپ تو سکتی ہیں! لیکن پامال نہیں ہو سکتیں! بگولوں کے ساتھ اُٹھ تو سکتی ہیں، لیکن اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتیں!!

کیا اب تو مجھے اپنا ساتھی بنانے پر تیار ہے؟ جو نہ کسی کو پوچھنا چاہتا ہے نہ خود کو پچھوانا!

اچھا! تو لے، یہ میرا ہاتھ ہے، اسے اپنے حسین ہاتھ سے متحرک کر، یہ میرا جسم ہے، اسے اپنی نرم و نازک باہوں میں بھینچ لے، اور یہ میرے لب ہیں، انہیں ایک طویل، عمیق اور خاموش بوسہ دے!

ہم اور تم

ہم ابنائے غم ہیں اور تم ابنائے مسرت!

ہم ابنائے غم ہیں اور غم، خدا کا سایہ ہے، جو گنہگار دلوں کے آس پاس اپنا مسکن نہیں بناتا، ہماری روحیں اُداس ہیں، اور اُداسی ایک بلند مرتبہ ہے، جو حقیر روحوں کو نہیں ملتا

ہم روتے ہیں، نالہ و ماتم کرتے ہیں، اے ہنسنے والو! اور جس کسی نے ایک مرتبہ اپنے آنسوؤں سے غسل کر لیا، وہ ابدالآباد تک کے لئے پاک و صاف ہو گیا۔

تم ہمیں نہیں جانتے، لیکن ہم تمہیں جانتے ہیں، تم بحرِ حیات کی طوفان خیز موجوں کے ساتھ بہے چلے جا رہے ہو، اور ہمیں پلٹ کر نہیں دیکھتے، لیکن ہم ساحل پہ بیٹھے تمہیں بھی دیکھ رہے ہیں اور تمہاری آوازیں بھی سن رہے ہیں، تم ہمارے نالہ و شیون پر کان نہیں دھرتے، اس لئے کہ زمانہ کی چیخ پکار تمہارے کانوں میں گونج رہی ہے، لیکن ہم تمہارے نغمے سن رہے ہیں، اس لئے کہ رات کی سرگوشیوں نے ہماری سماعت کو تیز کر دیا ہے، ہم تمہیں دیکھتے ہیں اسلئے کہ تم تاریک روشنی میں کھڑے ہو۔
لیکن تم ہمیں نہیں دیکھ سکتے اس لئے کہ ہم روشن تاریکی میں بیٹھے ہیں۔

ہم ابنائے غم ہیں! ہم پیغمبر، شاعر اور موسیقار ہیں، ہم اپنے دل کے تاروں سے دیوتاؤں کے لباس بنتے ہیں اور اپنے سینے کے ٹکڑوں سے فرشتوں کی مٹھیاں بھرتے ہیں۔

اور تم —— تم مسرتوں کی نیند اور لہو ولعب کی بیداری کی پیداوار ہو، تم اپنے دل دستِ جہالت کے حوالے کر دیتے ہو، اس لئے کہ جہالت کی انگلیاں نرم و نازک ہیں، اور نادانی کی قربت سے خوش ہوتے ہو، اس لئے کہ نادانی کا گھر، اُس آئینہ سے خالی ہے، جس میں تم اپنے چہرہ کا عکس دیکھ سکو

ہم آہیں بھرتے ہیں اور ہماری آہوں کے ساتھ، پھولوں کی سرگوشیاں، شاخوں کی سرسراہٹیں اور آبشار کے نغمے بلند ہوتے ہیں، لیکن تم ہنستے ہو اور تمہارے قہقہوں میں کھوپریوں کے پسنے کی آواز، بیڑیوں کی جھنکار اور دوزخ کی چیخ پکار شامل ہوتی ہے۔

ہم روتے ہیں اور ہمارے آنسو، زندگی کے دل میں ٹپکتے ہیں، جس طرح شبنم کے قطرے رات کی پلکوں سے صبح کے جگر میں، لیکن تم مسکراتے ہو اور تمہارے متبسم ہونٹوں سے قہر و غضب بہتا ہے، جس طرح سانپ کا زہر ڈسے ہوئے آدمی کے زخموں سے۔

ہم روتے ہیں، اس لئے کہ بیواؤں کی مظلومی و بیچارگی اور یتیموں کی بدبختی و بے دست و پائی دیکھتے ہیں اور تم ہنستے ہو، اس لئے کہ سونے کی چمک کے سوا، کچھ نہیں دیکھتے، ہم روتے ہیں، اس لئے کہ فقیروں کی کراہ اور مظلوموں کی پکار سنتے ہیں اور تم ہنستے ہو، اس لئے کہ جام و ساغر کی کھنک کے سوا

کچھ نہیں سُنتے، ہم روتے ہیں، اس لئے کہ ہماری روح ذاتِ خداوندی سے الگ ہوکر جسم میں مقید ہوگئی ہے، اور تم ہنستے ہو، اس لئے کہ تمہارے جسم راحت و اطمینان کے ساتھ خاک سے چمٹے ہوئے ہیں۔

ہم ابنائے غم ہیں اور تم ابنائے مسرت!

تو آؤ! ہم اپنے غم کے کارنامے دنیا کے سامنے رکھیں، اور تم اپنی مسرت کے اعمال!!

تم نے غلاموں کی کھوپڑیوں سے اہرام تعمیر کئے، اور اہرام، ریگ زار میں بیٹھے، قوموں کو تمہاری فنا اور ہماری بقا کی داستانیں سنا رہے ہیں، لیکن ہم نے آزاد بازوؤں کی قوت سے باستیل کو پاش پاش کیا، اور باستیل وہ لفظ ہے، جسے قومیں بار بار دُہرا کر، ہمیں مبارکباد دیتی ہیں اور تم پر لعنت بھیجتی ہیں۔

تم نے کمزوروں کے جسموں پر بابل کے باغ بنائے اور غمزدوں کی قبروں پر نینویٰ کے محلوں کی بنیاد رکھی۔ دیکھو! بابل و نینویٰ مٹ مٹا کر ایسے ہوگئے ہیں، جیسے ریگِ صحرا پر اونٹ کے پاؤں کے نشانات، لیکن ہم نے سنگِ مرمر سے عشترت کی مورتی بنائی اور اس طرح سنگ مرمر جامد ہوتے ہوئے جنبش میں آگیا، اور ساکت ہوتے ہوئے بولنے لگا۔ ہم نے ستار پر نہاوند کا راگ چھیڑا، اور فضا میں اُڑنے والی عاشقوں کی رُوحیں اس کی طرف کھنچ آئیں، ہم نے خطوط و الوان کی مدد سے مریمؑ کی تصویر

بنائی اور اس طرح خطوط کو دیوتاؤں کے افکار اور رنگ کو فرشتوں کے جذبات کی مثال کر دیا۔

تم لہو ولعب کے پیچھے پڑ گئے، جس کے خونخوار پنجوں نے روم اور انطاکیہ کے میدانوں میں سینکڑوں شہیدوں کو چیر پھاڑ کے رکھ دیا۔ اور ہم نے خاموشی سے ناتہ جوڑ لیا، جس نے انجیل کے مختلف حصے مرتب کئے۔

تم ناگفتہ خواہشوں کے گلے میں باہیں ڈالکر سو گئے، جن کے تند و تیز جھونکوں نے ہزاروں لاکھوں عورتوں کو ننگ و بدکاری کے جہنم میں جھونک دیا اور ہم تنہائی سے ہم کنار ہو گئے، جس کے سایہ میں سبعہ معلقہ ہملٹ اور دانتے کا قصیدہ، وجود میں آئے۔

تم نے حرص و طمع سے دوستی کی، جس کی تلواروں نے خون کی ہزاروں ندیاں بہادیں اور ہم نے تصور کی رفاقت اختیار کی، جس کے ہاتھوں نے معرفت کو نور کے بلند دائرہ سے اُتارا۔

ہم ابنائے غم ہیں اور تم ابنائے مسرت۔ اور ہمارے غم اور تمہاری مسرت کے درمیان ایک تنگ و دشوار گذار گھاٹی ہے جس میں سے تمہارے خوب صورت گھوڑے گذر سکتے ہیں نہ تمہارے چابک دست سوار اُسے طے کر سکتے ہیں۔

ہم تمہاری حقارت کو بہ نظر شفقت دیکھتے ہیں، لیکن تم ہماری بزرگی سے نفرت کرتے ہو اور زمانہ ہماری شفقت اور تمہاری نفرت کے درمیان کھڑا

ہمیں اور تمہیں حیرت سے دیکھتا ہے!

ہم دوستوں کی طرح تمہارے پاس آتے ہیں اور تم دشمنوں کی طرح ہم پر جھپٹتے ہو اور ہماری دوستی اور تمہاری دشمنی کے درمیان خون اور آنسوؤں سے بھرا ہوا ایک گہرا غار ہے!

ہم تمہارے لئے محل بناتے ہیں اور تم ہمارے لئے قبریں کھودتے ہو اور محلوں کی دلکشی اور قبروں کی تاریکی کے درمیان انسانیت فولادی پاؤں سے چلتی ہے۔

ہم تمہاری راہوں میں پھولوں کا فرش کرتے ہیں اور تم ہمارے بستروں میں کانٹے بچھاتے ہو اور گلاب کی پتیوں اور کانٹوں کے درمیان عفیفت، ابد کی نیند سو رہی ہے۔

ابتدائے آفرینش سے تم اپنی کھردری کمزوری کے ذریعہ ہماری نرم و نازک قوت سے برسرِ پیکار رہو۔ اگر ایک لمحہ کے لئے ہم پر غالب جاتے ہو تو مارے خوشی کے مینڈکوں کی طرح ٹرٹرانے لگتے ہو، لیکن ہم جو تم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غالب ہیں، دیوؤں کی طرح خاموش رہتے ہیں۔

تم نے مسیحؑ ناصری کو سولی پر چڑھایا اور چاروں طرف کھڑے ہو کر اس کا مذاق اڑایا، برا بھلا کہا، لیکن جب وہ گھڑی گذر گئی تو وہ صلیب سے اترا اور حق و روح کے ساتھ قوموں پر غلبہ پاتے ہوئے اور دنیا کو اپنے حسن و بزرگی سے روشن کرتے ہوئے ایک دیو کی طرح چلا گیا۔

تم نے سقراط کو زہر دیا، پال کو سنگسار کیا، گلیلیو کو موت کے

گھاٹ اُتارا، علیؓ ابن طالب کو شہید کیا، مدحت پاشا کو پھانسی چڑھایا، اور یہ سب کے سب آج بھی فتح مند بہادروں کی حیثیت سے زندہ ہیں، لیکن تم انسانیت کے حافظہ میں اُن لاشوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہو، جو خاک پر پڑی ہوں اور جنھیں نیستی و فراموشی کی تاریکیوں میں دفن کرنے والا نہ ملتا ہو ہم ابنائے غم ہیں، اور غم وہ بادل ہے، جو بنا بیں معرفت اور نیکی کا مینہ برساتا ہے، اور تم ابنائے مسرت ہو اور جب کبھی تمہاری مسرتیں بلند ہوتی ہیں سدھویں کے اُن ستونوں کی طرح بلند ہوتی ہیں جنھیں ہوا جڑ بنیاد سے اُکھاڑ پھینکتی ہے اور عناصر فنا کر دیتے ہیں۔

بنفشہ کا پھول

خیابانِ چمن میں، ایک نظر فریب و خوشبو دار بنفشہ کا پھول تھا، جو اپنے پڑوسیوں کے ساتھ سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا، اور لمبی لمبی گھاس کے حلقہ میں لہرا رہا تھا، ایک دن صبح کو جبکہ اس کے سر پر شبنم کا تاج رکھا تھا اُس نے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا، اُس کی نگاہ ایک نازک اندام و خوش قامت گلاب کے پھول پر پڑی۔ اُس کا "سر پر غرور" اس طرح بلند تھا، گویا زمردیں چراغ دان پر آگ کا شعلہ لرز رہا ہے۔

بنفشہ کے پھول نے اپنے نیلگوں ہونٹ وا کیے اور سرد آہ بھر کر کہنے لگا:

نباتی خوشبوؤں میں میرا حصہ کتنا کم اور پھولوں میں میرا درجہ کس قدر پست ہے۔ فطرت نے مجھے حقیر و ذلیل بنا کر پیدا کیا ہے، تاکہ میں زمین سے چمٹے چمٹے اپنی عمر گذار دوں، میں اپنا سر نیلگوں آسمان کی طرف اُٹھا سکتا ہوں، نہ اپنا رُخ، گلاب کے پھول کی طرح، سورج کی طرف کر سکتا ہوں

گلاب کے پھول نے اپنے پڑوسی بنفشہ کے پھول کی بات سُنی اور قہقہہ مار کر کہنے لگا۔

"تو بھی پھولوں میں کتنا مورکھ ہے! جو نعمت تجھے حاصل ہے، افسوس کہ تو اس کی قدر و قیمت سے واقف نہیں۔ تجھے فطرت نے وہ خوشبو، وہ حُسن اور وہ دلکشی عطا فرمائی ہے، جس سے اکثر پھول محروم ہیں، اپنے دل کو ان ناموزوں خیالوں اور شیطانی آرزوؤں سے پاک رکھ، اور اپنی تقدیر پر شاکر رہ، تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ جس کسی نے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیا، گویا اپنے مرتبہ کو بڑھا لیا، اور جس کسی نے حرص و طمع کی، گویا نقصان کو دعوت دی!"

بنفشہ کے پھول نے جواب دیا:

"میاں گلاب! تم مجھے تسلی دے رہے ہو، اس لئے کہ تمہیں وہ تمام امتیازات حاصل ہیں جن کی مجھے آرزو ہے۔ تم حکمانہ لہجے میں میرے احساس کمتری کو دور کرنا چاہ رہے ہو، اس لئے کہ تم بلند مرتبہ ہو، لیکن بدنصیب دلوں پر کامیابی و کامرانی کی نصیحتیں کیا اثر کر سکتی ہیں؟ اُف! کس قدر سنگدل ہے، وہ طاقت ور، جو کمزوروں میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے!!"

فطرت نے گلاب اور بنفشہ کے پھولوں کی گفتگو سُنی اور متعجب ہو کر انگڑائی لی۔

پھر ذرا بلند آواز میں بولی:

"میرے پیارے بنفشہ کے پھول! یہ تمہیں کیا ہو گیا؟ میں تو تمہیں، تمہاری عاجزی کی بنا پر، دلکش، نرمی و نزاکت کی بنا پر شیریں اور غربت

بچاؤ کی بنا پر شریف سمجھی تھی، کیا مکروہ خواہشوں نے تمہیں بھی گمراہ کردیا، کھوکھلی عظمت نے تمہاری عقل بھی چھین لی؟"

بنفشہ نے آرزومندانہ لہجے میں کہا:

اے عظمت وجبروت کی دیوی!! اے شفیق ومہربان ماں!! میں اپنے دل کی تمام آرزوؤں اور اپنی روح کی تمام امیدوں کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ تو میری التجا قبول کرلے اور مجھے خواہ ایک ہی دن کے لئے سہی، لیکن گلاب کا پھول بنا دے!"

فطرت نے غصہ سے جواب دیا:

تو نہیں جانتا کہ کیا مانگ رہا ہے؟ اور تجھے معلوم نہیں کہ ظاہری عظمت میں کتنی بلائیں پوشیدہ ہوتی ہیں، اگر میں نے تیرا قد بلند کردیا اور تیری صورت بدل کر تجھے گلاب کا پھول بنا دیا، تو اس وقت تجھے ندامت ہوگی — بے سود ندامت!"

بنفشہ نے کہا۔

"میرے بنفشئی وجود کو کشیدہ قامت اور بلند سر گلاب کے پھول سے بدل دے، اس کے بعد جو کچھ ہوگا، اس کی ذمہ داری تجھ پر نہیں میری حرص وطمع پر ہوگی۔"

فطرت نے جواب دیا:

"اے نادان وسرکش بنفشہ! میں نے تیری التجا قبول کی، لیکن اگر مشکلات ومصائب تجھے گھیر لیں تو اس کی شکایت مجھ سے نہیں، اپنی ذات سے کیجو!"

فطرت نے اپنی ننھی وسحر کار انگلیوں سے بنفشہ کی پتیوں کو مس کیا اور چشم زدن میں اُسے ایک خوش رنگ گلاب کا پھول بنا دیا، جو تمام پھولوں سے بلند تھا۔

دن ڈھلتے، فضا پر طوفاں خیز سیاہ بادل چھا گئے، سکونِ ہستی میں ہیجان پیدا ہوا، بجلی چمکنے لگی، بادل گرجنے لگے، اور بادو باراں کا لشکرِ جرار باغوں اور چمن زاروں سے آمادہ پیکار ہوگیا۔ شاخیں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ بڑے بڑے درخت جڑ سے اُکھڑ گئے، سر بلند پھول طوفان کے تھپیڑوں سے مٹی میں مل گئے اور اُن بیلوں اور پھولوں کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہی، جو زمین سے چمٹے ہوئے تھے یا چٹانوں میں پوشیدہ تھے۔

لیکن عناصر کے اس ہیجان نے دوسرے باغوں کو اتنا تباہ و برباد نہیں کیا، جتنا اُس چمن کو جس میں، اور فطرت نے بنفشہ کے پھول کو گلاب کا پھول بنایا تھا۔

چنانچہ جب طوفان فرو ہوا، اور بادل چھٹے تو اُس کے تمام پھول منتشر ذرات کی طرح ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے اور اس طوفان خیز ہنگامہ کے بعد کوئی چیز صحیح وسلامت نہ رہی تھی، سوائے بنفشہ کے اُن پھولوں کے جو چمن کی دیواروں تلے روپوش تھے۔

بنفشہ کے ایک نو شگفتہ پھول نے سر اٹھا کر دیکھا کہ چمن کے پھولوں اور درختوں پر کیا بیتی؟ وہ خوشی سے مسکرایا اور اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر کہنے لگا:

"دیکھو! آندھی نے اُن پھولوں کا کیا حشر کر دیا جو فخر و غرور کے ساتھ سر اونچا کیے کھڑے تھے؟"

دوسرے بنفشہ کے پھول نے کہا:

ہر چند ہم زمین پر پڑے ہیں، لیکن آندھی اور طوفان کے غیظ و غضب سے محفوظ ہیں۔"

تیسرا بنفشہ کا پھول بولا:

"یہ صحیح ہے کہ ہمارے جسم بہت حقیر ہیں، لیکن تباہیاں ہم پر غالب نہیں آ سکتیں۔"

اس وقت بنفشہ کے پھولوں کے بادشاہ نے نگاہ اٹھائی اور دیکھا کہ اس کے پاس وہ گلاب کا پھول پڑا ہے، جو کل تک بنفشہ کا پھول تھا۔ طوفان نے اُسے شاخ سے اُکھاڑ پھینکا ہے، آندھی کے تھپیڑوں نے اُس کی پتی پتی الگ کر دی ہے اور اب وہ نم آلود گھاس پر، اس طرح پڑا ہے، جیسے کسی مقتول کے سینہ میں دشمن کا تیر پیوست ہو۔

بادشاہ نے اپنا سر اونچا کیا، اُس کی پتیاں ذرا پھیلیں اور اُس نے اپنے ساتھیوں سے بلند آواز میں کہا:

"دیکھو! ذرا اس بنفشہ کے پھول کو دیکھو! جس نے لالچ میں آ کر

گلاب کے پھول کا لباس پہن لیا تاکہ تھوڑی سی دیر کے لئے سربلندی حاصل کرے اور پھر ہمیشہ کے لئے پستی میں گر جائے، یہ منظر تمہارے لئے عبرت کا سبب ہوگا!"

یہ سُن کر گلاب کا پھول، جو اس وقت جانکنی کے عالم میں تھا، مارے غصہ کے سر اٹھا، اس نے اپنی بچی کھچی قوتیں جمع کیں اور رُک رُک کر کہنے لگا:

"سنو! اے کم حوصلہ بے وقوفو! سنو! اے طوفانِ بادوباراں سے لرزہ براندام ہونے والو! کل تک میں تمہاری طرح اپنے سبز پتوں میں بیٹھا تقدیر پر قانع تھا اور یہ قناعت ایک دیوار حائل تھی، جو مجھے زندگی کے طوفانوں اور ہنگاموں سے الگ رکھتی تھی، جس نے میرے وجود کو راحت و اطمینان کے نشہ میں سرشار کر کے امن و سلامتی کے حلقہ میں گھیر رکھا تھا۔ میرے امکان میں تھا کہ میں کسی طرح زمین پر پڑے پڑے زندگی گزار دیتا، یہاں تک کہ موسم سرما اپنی برف باریوں سے مجھ پر چھا جاتا اور میں بھی اپنے پیش رو پھولوں کی طرح موت کی خاموش بستی میں پہنچ جاتا ــــ نیستی کی تاریکیوں میں گم ہو جاتا، اس سے پہلے کہ میں ہستی کے اسرار و رموز کو جانچتا اور اس طریق فکر سے ہٹ کر جانچتا جو سطح زمین پر نمودار ہونے کے بعد سے بنفشہ کے پھولوں نے اختیار کر رکھا ہے۔

ہاں! میرے امکان میں تھا کہ میں لالچ سے اپنا دامن پاک رکھتا۔ اور اُن چیزوں سے پرہیز کرتا، جو اپنی فطرت کے پیش نظر، میری

فطرت سے بلند ہیں، لیکن میں نے رات کی خاموشی پر کان لگائے اور عالم قدس کو اس عالم سے کہتے سنا:

✓ "وجود کی غایت ہی یہ ہے کہ ماورائے وجود کے لئے جدّوجہد کی جائے!"

یہ سن کر میری روح میرے خلاف آمادۂ بغاوت ہوگئی، اور میرا وجدان اس مقام کے لئے تڑپنے لگا، جو اس سے کہیں بلند تھا، میری روح بغاوت کرتی رہی، اور میں اُس بلند مقام کے لئے تڑپتا رہا، یہاں تک کہ میری سرکشی ایک فعال قوت سے بدل گئی اور میرا شوق ایک خلّاق ارادہ سے، چنانچہ میں نے فطرت سے درخواست کی ——— اور فطرت ہمارے پوشیدہ خیالات کے خارجی مظاہر کے سوا کچھ نہیں ——— کہ مجھے گلاب کا پھول بنا دے اور اُس نے میری درخواست قبول کرلی۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی، بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ فطرت نے اپنے آثار و نقوش اپنے ہاتھوں اور اپنی خوشی سے بدلکر رکھدیئے ہیں۔

گلاب کا پھول تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگیا، اس کے بعد فخر و امتیاز کے لہجہ میں بولا:

"وہ ایک ساعت جو میں نے گلاب کے پھول کی حیثیت سے گذاری ہے درحقیقت ایک بادشاہ کی طرح گذاری ہے۔ میں نے کائنات کو گلاب کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اینھر کی سرگوشیوں کو گلاب کے کانوں سے

سُنا ہے اور نور کے دامن کو گلاب کی پتیوں سے چھوا ہے، تم میں کوئی ہے جو اس شرف و امتیاز میں میری ہمسری کا دعویٰ کرے؟"

اس کی گردن جھک گئی اور اس نے ایسی آواز میں جس سے موت کا شدید کرب ظاہر ہوتا تھا کہا:

"میں اب مر رہا ہوں، مر رہا ہوں اور میری روح میں وہ کیفیت ہے جو مجھ سے پہلے بنفشہ کے کسی پھول میں نہ تھی، مجھے تمام وہ حقیقتیں معلوم ہیں جو اس محدود دائرہ کے پیچھے آسودہ ہیں جس میں میں پیدا ہوا تھا، اور یہی زندگی کا مقصد ہے۔ ہاں یہی وہ جوہر ہے، جو شب و روز کے پردہ میں روپوش ہے۔"

گلاب کی پتیاں مرجھا گئیں، اس میں قدرے لرزش پیدا ہوئی اور وہ مر گیا اس کے چہرہ پر مقدس تبسم کھیل رہا تھا۔ منّت کا تبسم جس نے اپنی بلند آرزوؤں سے زندگی کی تصدیق کر دی فتح و کامرانی کا تبسم — خداوندی تبسم!

روگ

میری ایک ڈاڑھ میں کیڑا لگ گیا تھا، جو مجھے طرح طرح سے پریشان کرتا دن کے ہنگاموں میں اطمینان سے بیٹھ جاتا اور رات کی خاموشیوں میں جب دندان ساز خوابِ راحت کے مزے میں سرشار ہوتے اور دوا خانے بند ــــ بے قرار ہو کر اُٹھ بیٹھتا۔

ایک دن، جب کہ میرے صبر کا پیمانہ بالکل لبریز ہو گیا تو میں ایک دندان ساز کے پاس گیا اور کہا۔

"اس ڈاڑھ کو نکال دیجئے، اس نے نیند کی لذت مجھ پر حرام کر رکھی ہے اور میری رات کے سکون و اطمینان کو آہ و کراہ سے بدل دیا ہے"

ڈاکٹر نے اپنا سر ہلایا اور جواب دیا:

"جہالت ہو گی اگر ہم ڈاڑھ کو نکال دیں جبکہ اس کا علاج ہو سکتا ہے!"

اُس نے ڈاڑھ کو اِدھر اُدھر سے کھرچنا شروع کیا اور اس کی جڑوں کو صاف کر دیا عجیب عجیب طریقوں سے روگ کو دور کرنے کے بعد جب اُسے یقین ہو گیا کہ ڈاڑھ میں اب ایک کیڑا بھی باقی نہیں رہا تو اس کے

سوراخوں کو ایک خاص قسم کے سونے سے بھر دیا اور فخر آمیز لہجے میں کہنے لگا:

"اب تمہاری یہ ڈاڑھ تندرست ڈاڑھوں سے زیادہ مضبوط ہو گئی!"

میں نے تائید کی اور اس کی جیب اشرفیوں سے بھر کر خوشی خوشی چلا آیا لیکن ابھی ایک ہفتہ نہ گذرنے پایا تھا کہ کم بخت ڈاڑھ میں پھر تکلیف شروع ہوئی اور اس نے میری روح کے نغموں کو پھر قریب المرگ لوگوں کی خرخراہٹ اور دوزخ کی چیخ پکار سے بدل دیا۔

اب میں دوسرے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اور محتاط لہجہ میں اس سے کہا:

"اس خطرناک سنہری ڈاڑھ کو نکال پھینکئے! ــــ تکلف بالکل نہ فرمایئے اس لئے کہ کنکریاں چبانے والا انہیں شمار کرنے والوں سے مختلف ہوتا ہے!"

ڈاکٹر نے ڈاڑھ نکال دی، وہ گھڑی اگرچہ درد و تکلیف کی بنا پر بڑی ہولناک تھی، لیکن درحقیقت مبارک تھی۔

ڈاڑھ نکال دینے اور اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کر لینے کے بعد ڈاکٹر نے کہا:

"آپ نے بہت اچھا کیا ــــ کیڑوں نے اس ڈاڑھ میں اچھی طرح جڑ پکڑ لی تھی اور اس کے اچھے ہونے کی کوئی امید نہ تھی"

اس رات میں نہایت آرام سے سویا ــــ اب بھی آرام سے ہوں اور ڈاڑھ کے نکل جانے پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔

انسانی سماج کے منہ میں بہت سی ڈاڑھیں ہیں، جن میں کیڑا لگا ہوا

ہے اور یہ روگ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ "عظم الفک" کی حد تک پہنچ گیا ہے لیکن انسانی سماج اس کی تکلیف سے بچنے کے لئے ڈاڑھیں نہیں نکلواتا۔ بلکہ محض لیپا پوتی پر اکتفا کرتا ہے، وہ انہیں باہر سے صاف کرا کے سوراخوں کو چمکدار سونے سے بھروا دیتا ہے اور بس!

بہت سے طبیب ہیں، جو انسانیت کی ڈاڑھوں کا علاج، نظر فریب سونے کے پانی اور چمک دار مادوں سے کرتے ہیں اور بہت سے مریض ہیں جو خود کو ان اصلاح پسند طبیبوں کے حوالے کر دیتے ہیں، اور بیماری کی تکلیف برداشت کرتے کرتے، مبتلائے فریب رہ کر مر جاتے ہیں۔

پھر وہ قوم جو ایک دفعہ بیمار ہو کر، مر جاتی ہے، دوبارہ زندہ نہیں ہوتی کہ دنیا کے سامنے اپنے معنوی امراض کے اسباب اور اُن اجتماعی ڈاڑھوں کی حقیقت بیان کرے، جن کو استعمال کرنے سے قومیں زوال و نیستی کی منزل میں پہنچ جاتی ہیں۔

شامی قوم کے منہ میں بھی، فرسودہ، سیاہ، گندی اور بدبودار ڈاڑھیں ہیں، ہمارے طبیبوں نے چاہا بھی کہ انہیں صاف کر کے اُن کے سوراخوں کو چمکدار مادوں سے بھر دیں، اور اوپر سونے کا پانی چڑھائیں لیکن روگ دور نہیں ہوا، اور کبھی نہیں ہو سکتا، جب تک ان ڈاڑھوں کو اکھاڑ کر پھینک نہ دیا جائے، پھر جس قوم کی ڈاڑھ میں کوئی روگ ہو تو اس کا معدہ بھی ضعیف ہو جاتا ہے، اور بہت سی قومیں ہیں، جو

خرابیٔ ہضم کا شکار رہو کر، موت کے مُنہ میں جا چکی ہیں۔

اگر کوئی شام کی گہرائی ڈاڑھیں دیکھنی چاہتا ہے تو اسے مدرسہ میں جانا چاہیئے، جہاں مستقبل کا انسان اُن مسائل کو یاد کر رہا ہے جو اخفش نے سیبویہ سے نقل کیئے ہیں اور سیبویہ نے ساقی اطلقان سے۔

یا عدالت میں جانا چاہیئے، جہاں گمراہ ذہانت، قانونی احکام سے اس طرح کھیلتی ہے، جس طرح بلّی اپنے شکار سے۔

یا امیروں کے محل میں جانا چاہیئے، جہاں بناوٹ، جھوٹ اور ریاکاری ہے۔

یا غریبوں کی جھونپڑیوں میں جانا چاہیئے، جہاں، خوف، بزدلی اور جہالت ہے۔

اور اس کے بعد اُن نرم و نازک انگلیوں والے دندان سازوں کے ہاں جانا چاہیئے جن کے پاس باریک آلات اور نشتر اور سفوف ہیں اور جو گہرائی داڑھوں کے سوراخ بھرنے اور گیلی جڑوں کو صاف کرنے میں اپنے اوقات بسر کرتے ہیں، جب کوئی ان سے گفتگو کرتا ہے یا ان کے عطیوں سے نفع اندوز ہونا چاہتا ہے تو انہیں اُن بزرگ خطیبوں میں سے پاتا ہے، جن کی زبان فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتی ہے، جو جماعتیں بناتے ہیں، کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں اور مجمعوں میں زورِ خطابت سے آگ لگا دیتے ہیں، جن کی تقریروں میں ایک نغمہ ہوتا ہے، چکّی کے پاٹوں کے نغمہ سے زیادہ بلند اور جولائی کی راتوں میں مینڈک کی ٹراہٹ سے زیادہ دلکش۔

لیکن جب کوئی اُن سے کہتا ہے:

"شامی قوم اپنی زندگی کی غذا ر، کیڑا لگی داڑھوں سے چباتی ہے، اس لئے اُس کے ہر لقمہ میں زہریلا لعاب شامل ہو جاتا ہے اور اس زہریلے لعاب نے اُس کی آنتیں تقریباً بیکار کر دی ہیں۔"

جب کوئی اُن سے یہ کہتا ہے تو وہ جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"جی ہاں اس کے لئے ہم ایک نئی دوا کی ایجاد میں مصروف ہیں، جو بہت زیادہ لذیذ اور ہو گی۔"

اور کہنے والا جب یہ کہتا ہے کہ

"ان داڑھوں کو نکلوا دینے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

تو وہ قہقہہ لگاتے ہیں اس لئے اور صرف اس لئے کہ اُنہوں نے دانتوں کا شریفانہ علاج نہیں سیکھا۔

سوال کے دُہرائے جانے پر وہ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور بیزاری کے لہجہ میں اپنے دل سے کہتے ہیں۔

کس قدر ہیں دُنیا میں خیال کے بندے اور کتنے بے بنیاد ہیں ان کے خیال؟"

نیشتر

"وہ اپنے اصولوں میں جنون کی حد تک انتہا پسند ہے"

"وہ خیال پرست ہے، اور جو کچھ لکھتا ہے، مروجہ اخلاق میں فساد پیدا کرانے کے لئے لکھتا ہے"

"اگر شادی شدہ اور غیر شادی شدہ مرد و عورت، شادی کے مسئلے میں جبران کی رائے پر چلیں گے تو معاشرتی زندگی کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا، انسانی سماج کی بنیادیں منہدم ہو جائیں گی اور یہ دنیا ایک جہنم اور اس میں رہنے والے شیطان بنکر رہ جائیں گے"

"اس کے حسنِ نگارش کے فریب سے بچو! کہ وہ انسانیت کا دشمن ہے"

وہ انارکسٹ ہے! کافر ہے!! ملحد ہے!!! اور ہم مقدس کوہِ لبنان کے باشندوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اس کے عقائد پر لات مار دیں۔ اس کی تصنیفات کو آگ میں جھونک دیں، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو، کہ اُس کے ملحدانہ نظریوں کا کوئی اثر، دل پر باقی رہ جائے!"

"ہم نے اس کا ناول "ٹوٹے ہوئے پر" پڑھا اور اُسے زہریلا پایا۔"

یہ ہیں اُن خیالات کے چند نمونے، جو لوگوں نے میرے متعلق ظاہر کئے ہیں، یہ سچ ہے کہ میں جنون کی حد تک انتہا پسند ہوں، تعمیر کے مقابلہ میں تخریب کی طرف مائل ہوں، میرا دل ان چیزوں سے متنفر ہے، جن کا دنیا احترام کرتی ہے اور ان چیزوں سے محبت کرتا ہے، جنھیں دنیا ٹھکراتی ہے، اور اگر انسان کے عقائد، رسم و رواج اور عادات و خصائل کا استیصال میرے امکان میں ہوتا، تو میں ایک لمحہ کے لئے توقف نہ کرتا، لیکن بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ میری تصنیفات "زہر ملا پانی" ہیں، ایک ایسی بات ہے، جو حقیقت کو ظاہر تو کرتی ہے لیکن دبیز پردے کے پیچھے سے ــــــ اور حقیقت عریاں، یہ ہے، کہ میں زہر کو پانی میں ملا کر نہیں، خالصًا پیالوں میں انڈیلتا ہوں، ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ جن پیالوں میں انڈیلتا ہوں، وہ حد درجہ صاف و شفاف ہوتے ہیں۔

رہے وہ حضرات، جو اپنے دلوں میں میری طرف سے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ "وہ خیال پرست ہے اور بادلوں کی دُنیا میں اُڑتا رہتا ہے"، سو یہ وہ لوگ ہیں، جو ان شفاف پیالوں کی چمک پر اپنی نگاہیں گاڑ دیتے ہیں اور اس شراب سے جو اُن پیالوں میں ہوتی ہے اور جسے وہ "زہر" کہتے ہیں قطع نظر کر لیتے ہیں۔ اس لئے اور صرف اس لئے کہ ان کے کمزور معدے اُسے ہضم نہیں کر سکتے۔

یہ تمہید ایک اکھڑ قسم کی گستاخی پر دلالت کرتی ہے، لیکن گستاخی کا اکھڑپن، مکر و فریب کی ملائمت سے بہتر نہیں ہے؟ گستاخی خود کو اپنے اصلی روپ میں ظاہر کرتی ہے، لیکن فریب مانگے کا لباس پہنکر ہمارے سامنے آتا ہے

اہلِ مشرق چاہتے ہیں کہ ادیب اس شہد کی مکھی کی مثال ہو جائے، جو چھتہ بنانے کے لئے باغوں میں پھولوں کی شیرینی جمع کرتی پھرتی ہے۔

اہلِ مشرق شہد پر جان دیتے ہیں، اور اس کے سوا انہیں کوئی غذا نہیں بھاتی، انہوں نے اس کثرت سے شہد استعمال کیا ہے کہ وہ خود شہد بن کر رہ گئے ہیں، جو آگ کے سامنے پگھل جاتا ہے اور اس وقت تک منجمد نہیں ہوتا، جب تک کہ اُسے برف پر نہ رکھا جائے۔

اہلِ مشرق چاہتے ہیں کہ شاعر اُن کے بادشاہوں، حاکموں اور پادریوں کے سامنے اپنی روح کو عود و لوبان کی طرح سلگائیں، اور ہر چند کہ مشرق کی فضا درباروں، قربان گاہوں اور مقبروں میں سلگائے ہوئے

عود ولوبان کے دھوئیں سے اَٹ گئی ہے، لیکن وہ اب بھی مطمئن نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں متنبی جیسے قصیدہ نگار، ضضاد جیسے مرثیہ گو اور صفی الدین حلی سے زیادہ بھلے، بھانڈ پلئے جاتے ہیں۔

اہلِ مشرق چاہتے ہیں کہ مفکر اُن کے سامنے بیدبا، ابن رشد، افرام سریانی اور یوحنا دمشقی کے اقوال دہراتا رہے اور اپنی تحریروں میں احمقانہ پند ونصیحت کا یعنی ارشاد و ہدایت اور اُن آیات و حکم کی حدود سے تجاوز نہ کرے، جن پر عمل کرنے سے انسان کی زندگی اُس حقیر گھاس پھونس کی مثال ہو جاتی ہے جو سائے میں اُگے اور اُس کا نفس اُس کنکنے پانی سے مشابہ ہو جاتا ہے، جس میں تھوڑی سی افیون ملی ہو۔

مختصر یہ کہ اہل مشرق ماضی کی نزہت گاہوں میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ جھوٹی تسلیاں دینے والے اور مضحکہ خیز سلبی اُمور سے دلچسپی رکھتے ہیں مگر اُن مجرد تعلیمات اور ایجابی اصولوں سے بھاگتے ہیں جو ڈنک مارتے ہیں اور انہیں پُر سکون خوابوں کی گہری نیند سے بیدار کرتے ہیں۔

مشرق بیمار ہے اُسے مستقل بیماریوں اور مسلسل وباؤں نے اس قدر گھیر رکھا ہے کہ وہ بیماری کا عادی اور تکلیف سے مانوس ہو کر اپنے درد و الم کو طبعی صفات بلکہ ایک حسین و خوشگوار مزاج سمجھنے لگا ہے، جو صحت مند جسم اور پُر عظمت روح کے لئے مخصوص ہے، اس کے نزدیک اگر کوئی ان بیماریوں اور تکلیفوں سے محفوظ ہے، تو ناقص ہے اور قدرت کے

عملیوں اور کمالاتِ عالیہ سے محروم!

مشرق کے بہت سے طبیب ہیں، جو اس کی نبض دیکھتے ہیں، اس کی بیماری کے متعلق باہمی طور پر مشورے کرتے ہیں، لیکن جب علاج کی نوبت آتی ہے تو وہی ہنگامی نشہ آور دوائیں دیتے ہیں جو مرض کی مدت تو بڑھا دیتی ہیں، لیکن اُسے زائل نہیں کرتیں۔

ان معنوی مخدرات کی بہت سی قسمیں ہیں، بہت سی شکلیں اور بہت سے رنگ ہیں، اور یہ ایک دوسرے سے اس طرح پیدا ہوتے ہیں، جس طرح ایک بیماری سے دوسری بیماری اور ایک مصیبت سے دوسری مصیبت پیدا ہوتی ہے، چنانچہ مشرق میں جب کبھی کوئی نیا مرض نمودار ہوتا ہے اس کے لئے مشرقی اطبا نیا مخدر ایجاد کر لیتے ہیں۔

لیکن وہ اسباب جن کے نتیجہ میں یہ مخدرات ایجاد کئے جاتے ہیں، حدِ شمار سے باہر ہیں، جن میں سب سے اہم سبب بیمار کا قضاؤ قدر کے مشہور فلسفہ پر ایمان لانا، اور طبیبوں کی بزدلی اور راس الم کے ہیجان سے خوف کھانا ہے، جسے سرسبز و شاداب وادیاں پیدا کرتی ہیں۔

اب میں اُن مسکنات و مخدرات کی مختلف مثالیں پیش کرتا ہوں، جو اطبائے مشرق نے، وطنی، مذہبی، اور معاشرتی بیماریوں کے لئے ایجاد فرمائے ہیں:

شوہر کے دل میں بیوی کی طرف سے اور بیوی کے دل میں شوہر کی طرف سے بعض زندہ اور فطری اسباب کی بنا پر نفرت بیٹھ جاتی ہے

اور وہ دونوں لڑ بھڑ کے، مار پیٹ کر کے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں لیکن چوبیس گھنٹے گذرنے نہیں پاتے کہ مرد کے رشتہ دار اُس کی بیوی کے رشتہ داروں کے پاس جاتے ہیں، تھوڑی دیر تک حسین وشستہ الفاظ کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کے بعد سب اس امر پر متفق ہو جاتے ہیں کہ میاں بیوی میں صلح کرا دیجائے، چنانچہ یہ قافلہ عورت کے پاس آتا ہے اور اُن جھوٹی سچی نصیحتوں سے اُس کے جذبات کو لُبھاتا ہے، جو اُسے شرمندہ تو کر دیتی ہیں، لیکن مطمئن نہیں کر سکتیں۔ اس کے بعد مرد کو بلایا جاتا ہے اور اس پر اُن اچھی اچھی باتوں اور عمدہ عمدہ مثالوں کی بوچھار شروع کر دیجاتی ہے، جو اس کے خیالات میں نرمی تو پیدا کر دیتی ہیں لیکن انہیں بدل نہیں سکتیں اور اس طرح ان میاں بیوی میں، جو روحانی طور پر ایک دوسرے سے متنفر ہیں، صلح — ہنگامی صلح — کا مقدس فرض انجام دے دیا جاتا ہے۔ اب وہ میاں بیوی، اپنے ارادہ کے خلاف پھر ایک جگہ رہنا شروع کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ ملمع اُتر جاتا ہے، اور اُس مخدر کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے، جو عزیزوں اور رشتہ داروں نے استعمال کرایا تھا، چنانچہ مرد پھر اپنی نفرت و کراہت کا اظہار کرنے لگتا ہے اور عورت پھر اپنی بدقسمتی کا پردہ چاک کر دینا چاہتی ہے، لیکن وہی لوگ جنھوں نے پہلے صلح کرائی تھی، دوبارہ یہ اہم فرض انجام دیتے ہیں، اچھے شوہر اور بیوی، سو جو کوئی مخدرات کا ایک قطرہ پی لے وہ بھرے ہوئے جام پینے سے بھی انکار نہیں کرتا۔

قوم جابر حکومت یا قدیم نظام کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ اور "جمعیۃ اصلاحیہ" کی بنیاد رکھ کر ترقی اور آزادی کی طرف قدم بڑھاتی ہے گرم گرم تقریریں کی جاتی ہیں، بے دھڑک مضامین لکھے جاتے ہیں ؛ "مینزاینیہ" اور "لائحہ عمل" شائع ہوتے ہیں، وفد اور نمائندے بھیجے جاتے ہیں، لیکن ایک یا زیادہ سے زیادہ دو مہینے نہیں گذرنے پاتے جو ہم سنتے ہیں کہ حکومت نے جماعت کے لیڈر کو گرفتار کر لیا، یا اس کا وظیفہ مقرر کر دیا، اس کے بعد "جمعیۃ اصلاحیہ" کے متعلق کچھ سننے میں نہیں آتا اس لئے کہ اس کے ارکان مخدرات کے چند قطرے پی کر، پھر سکون و اطاعت کی طرف لوٹ جاتے ہیں،

جماعت، بنیادی امور کے پیش نظر، اپنے مذہبی پیشوا کے خلاف آواز اُٹھاتی ہے، اس کی شخصیت کو اپنی تنقید کا ہدف بناتی ہے، اُس کے افعال پر نکتہ چینی کرتی ہے، اس کی روش کو ٹھکراتی ہے، اور اُسے ایک نیا مذہب اختیار کر لینے کے ڈراوے دیتی ہے، جو عقل سے قریب اور اوہام و خرافات سے دور ہوگا، لیکن زیادہ عرصہ نہیں گذرتا، جو سننے میں آتا ہے کہ ملک کے عقلمندوں نے مذہبی پیشوا اور اُس کے پیروؤں کی مخالفت دور کر دی ہے اور طلسمی مخدرات کے فیض اثر سے مرشد کی شخصیت میں وہی ہیبت و جلال اور حلقہ بگوشوں کے دل میں وہی اندھی اطاعت پھر پیدا ہو گئی ہے۔

کمزور مظلوم، طاقت ور ظالم کے ظلم کی شکایت کرتا ہے تو یہ کہتا ہے

"خاموش! وہ آنکھ، جو تیر کا مقابلہ کرتی ہے، پھوڑ دی جاتی ہے!"

دیہاتی راہبوں کے اخلاص اور پرہیزگاری کے متعلق شبہ کا اظہار کرتا ہے تو اس کا ساتھی کہتا ہے:

"چپ! کتاب میں آیا ہے کہ اُن کی بات سنو، لیکن اُن کے افعال کی تقلید نہ کرو!"

شاگرد، بصرہ اور کوفہ کے علمائے نحو کی بحثوں کو یاد کرنے سے گریز کرتا ہے تو استاد کہتا ہے:

کاہل اور سست لوگوں نے اپنے لئے ایسے عذر تراش لئے ہیں جو گناہ سے زیادہ قابلِ نفرت ہیں۔"

نوجوان لڑکی بیواؤں کی سی زندگی بسر کرنے سے بچتی ہے تو اس کی ماں کہتی ہے:

"لڑکی اپنی ماں سے افضل نہیں ہوتی، اس لئے جو راستہ تیری ماں نے اختیار کیا تھا، تو بھی وہی اختیار کر!"

نوجوان لڑکا فضول مذہبی رسموں کے متعلق سوال کرتا ہے تو پادری جواب دیتا ہے:

"جو کوئی ایمان کی آنکھ سے نہیں دیکھتا اُسے اس دنیا میں کہر اور دھوئیں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔"

ایک زمانہ اسی طرح گذر گیا، لیکن مشرق کا انسان اپنے نرم و گداز بستر میں پڑا سو رہا ہے۔ جب کبھی مچھر کاٹتے ہیں تو ایک لمحہ کے لئے

بیدار ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد پھر ان مخدرات کے زیر اثر جو اُس کے جسم کی ہر رگ اور خون کے ہر قطرہ میں کارفرما ہیں، سو جاتا ہے۔

جب کوئی شخص کھڑے ہو کر سونے والوں کو پکارتا ہے اور اُن کے گھروں عبادتگاہوں اور عدالتوں کو اپنی بلند آوازوں سے لبریز کر دیتا ہے تو وہ اپنی ابدی نیند سے بوجھل آنکھیں کھولتے ہیں اور جمائیاں لے لے کر کہتے ہیں:

"کس قدر بدتمیز ہے یہ نوجوان کہ نہ خود سوتا ہے، نہ دوسروں کو سونے دیتا ہے"

اس کے بعد پھر اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اپنی روح سے باندازِ سرگوشی کہتے ہیں:

"وہ کافر ہے! ملحد ہے!! مروجہ اخلاق میں فساد پیدا کرتا ہے، قوموں کی بنیادوں کو ڈھاتا ہے، اور انسانیت کا سینہ اپنے باریک تیروں سے چھلنی کرتا ہے"

جب میں ان بیدار اور سرکش لوگوں میں تھا، جو مخدرات اور مسکنات کے استعمال سے انکار کرتے ہیں تو اکثر اپنے نفس سے سوالات کرتا تھا اور میرا نفس مبہم اور مشتبہ الفاظ میں جواب دیتا تھا، لیکن جب میں نے سُنا کہ لوگ میرے نام پر لعنت بھیجتے ہیں اور میرے اصولوں پر تھوتھو کرتے ہیں تو مجھے اپنی بیداری کی حقیقت کا یقین ہو گیا اور میں نے جان لیا کہ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں، جو خوشگوار خوابوں اور دلکش خیالوں

کے بندے ہیں، بلکہ اُن وحدت پسندوں میں سے ہوں جو زندگی کو اُن تنگ راہوں کے ذریعہ طے کرتے ہیں، جن پر پھول اور کانٹے بچھے ہیں، اور جن کے چاروں طرف شکاری بھیڑیے اور چہچہاتی ہوئی بلبلیں ہیں۔

اگر بیداری کوئی فضیلت ہوتی تو میری حیا مجھے اس کے دعوے سے ضرور باز رکھتی، لیکن وہ کوئی فضیلت نہیں ہے، بلکہ ایک عجیب و غریب حقیقت ہے، جو وحدت پسند افراد پر غفلت و بے خبری کے عالم میں منکشف ہو کر اُن کے آگے آگے چلتی ہے اور وہ اس کے مخفی تاروں میں بندھے اور ہولناک مقاصد پر نگاہیں جمائے اُس کے ساتھ ساتھ ہو لیتے ہیں۔

میرے نزدیک شخصی حقائق کے اظہار میں شرم محسوس کرنا، طمع شدہ مکاری کی ایک قسم ہے۔ جسے اہلِ مشرق "تہذیب" کے ساحت فریب نام سے پکارتے ہیں۔

کل جب ہمارے "اُدبائے متفکرین" میرے ان خیالات کو پڑھیں گے تو نفرت و بیزاری کے لہجہ میں کہیں گے:

"وہ انتہا پسند ہے جو زندگی کے تاریک پہلو کو دیکھتا ہے اور تاریکی کے سوا، اُسے اور کچھ نظر نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ وہ مسلسل ہم پر رو رہا ہے اور لگاتار ہماری حالت پر ماتم کر رہا ہے"

میں ان اُدبائے متفکرین کی خدمت میں عرض کرتا ہوں:

"میں مشرق پر ماتم کرتا ہوں اس لئے کہ مردہ لاش کے سامنے

رقص کرنا انتہائی درجہ کا پاگل پن ہے!

میں اہلِ مشرق پر روتا ہوں اس لئے کہ بیماریوں پر ہنسنا، جہلِ مرکب ہے!
میں اُس پیارے ملک کا مرثیہ پڑھتا ہوں، اس لئے کہ اندھی مصیبت کے سامنے گانا، اندھی جہالت ہے۔

میں انتہا پسند ہوں، اس لئے کہ جو کوئی حقیقت کے اظہار میں اعتدال سے کام لیتا ہے، وہ اس کے نصف حصّہ کو بیان کرتا ہے اور نصف آخر کہنے والے کے اُس خوف میں چھپا رہ جاتا ہے جو اُسے لوگوں کی بدگمانیوں اور خیال آرائیوں سے ہوتا ہے۔

میں سڑی ہوئی لاش دیکھتا ہوں تو میرا دل اس قدر نفرت کھاتا ہے اور میری روح اس درجہ مضطرب ہو جاتی ہے کہ میں اُس کے پاس نہیں بیٹھ سکتا، خواہ میرے دائیں ہاتھ پر شراب کا پیالہ ہو اور بائیں ہاتھ پر شیرینی کی طشتری!

اس بنا پر اگر کوئی میرے نوحوں کو قہقہوں سے، میری نفرت کو محبت سے اور میری انتہا پسندی کو اعتدال سے بدلنا چاہتا ہے تو مجھے اہلِ مشرق میں کوئی ایسا حاکم عادل دکھلائے، جو مذہب کا پابند ہو، اور صحیح راہ پر چلتا ہو، مجھے کسی ایسے مذہبی پیشوا کا پتہ دے، جس کے علم و عمل میں مطابقت ہو، اور مجھے کوئی ایسا شوہر بتلائے، جو اپنی بیوی کو بھی اسی آنکھ سے دیکھتا ہو، جس آنکھ سے وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔

اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ مجھے رقصاں دیکھے یا ڈھول اور بانسری بجاتے

سُنے تو اُسے چاہئے کہ مجھے شادی کی محفل میں بلائے، نہ یہ کہ قبرستان میں جا کے کھڑا کر دے۔

ماتم

میرے عزیز مر گئے اور میں زندگی کی قید میں گرفتار، وحدت و تنہائی کے عالم میں اُن پر ماتم کر رہا ہوں!

میرے دوست مجھ سے بچھڑ گئے اور میری زندگی، اُن کے بعد غم و آلام کی مُنہ بولتی تصویر بن کر رہ گئی!

میرے عزیز اور دوست موت کی نیند سو گئے اور میرے وطن کی پہاڑیاں اشک و خون میں نہا گئیں، لیکن میں یہاں اسی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں، جس طرح زندگی کے شالوں اور آفتاب کی شعاعوں سے روشن پہاڑیوں پر اُچھلنے کودنے والے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ بسر کرتا تھا۔

میرے عزیز فاقوں سے مر گئے اور جو بچ گیا، وہ تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا، لیکن میں اُن لوگوں میں چل پھر رہا ہوں، جو مسرور ہیں، شادکام ہیں۔ اچھی سے اچھی غذائیں کھاتے ہیں۔ بہتر سے بہتر شرابیں پیتے ہیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ مسہریوں پر سوتے ہیں، جو زندگی سے خوش ہوتے ہیں

اور جس سے زندگی خوش ہوتی ہے۔

میرے عزیز نہایت ذلت و حقارت کی موت مر گئے لیکن میں یہاں راحت و سلامتی کی زندگی گذار رہا ہوں اور یہی وہ المناک ڈرامہ ہے جو میری روح کے اسٹیج پر کھیلا جا رہا ہے!

اگر میں اپنے بھوکے عزیزوں میں بھوکا ہوتا یا اپنی مظلوم قوم کے ساتھ جور و ظلم برداشت کرتا تو دونوں کا دباؤ، میرے سینہ پر اتنا شدید نہ ہوتا اور راتیں میری نگاہ میں اتنی سیاہ نہ ہوتیں اس لئے کہ جو کوئی مصیبت و بے چارگی میں اپنے عزیزوں کا ساتھ دیتا ہے، وہ ایک ایسی مقدس تسکین محسوس کرتا ہے، جو اپنے وجود کے لئے جذبۂ شہادت کی مرہون ہوتی ہے بلکہ وہ اپنی ذات پر فخر کرتا ہے۔ میں بیگناہوں کے ساتھ بیگناہ مر رہا ہوں۔ لیکن میں اپنی بھوکی اور مظلوم قوم کے ساتھ نہیں جبکہ وہ موت کے جلوس کے ہمراہ شہادت کی بلندیوں کی طرف جا رہی ہے، بلکہ یہاں —— سات سمندر پار —— اطمینان کے سائے اور سلامتی کے گہوارہ میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔

یہاں میں مصیبت اور مصیبت زدوں سے دور ہوں اور کسی چیز یہاں تک کہ اپنے آنسوؤں پر بھی فخر نہیں کر سکتا،

ایک پردیسی، جو اپنے وطن سے کوسوں دور ہو، بھوکے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے؟!

کاش میں جانتا، شاعر کے نالہ و ماتم کا فائدہ کیا ہے؟

اگر میں خاکِ وطن میں گیہوں کا پودا ہوتا تو بھوکا بچہ مجھے توڑ کر، میرے دانوں کے ذریعہ دستِ اجل کو اپنے سینے سے ہٹا دیتا۔

اگر میں اپنے ملک کے باغوں کا پختہ پھل ہوتا تو بھوکی عورت مجھے کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھا لیتی!

اگر میں اپنے وطن کی فضا میں پرندہ ہوتا، تو بھوکا مرد مجھے شکار کر کے میرے جسم کی بدولت، اپنے جسم سے، قبر کا سایہ دور کر دیتا۔

لیکن آہ! کتنی بیچارگی اور افسوس کا مقام ہے کہ میں شام کے کھیتوں میں گیہوں کا پودا ہوں، نہ لبنان کی وادیوں کا پختہ پھل!!

اور یہی وہ خاموش ابتلا ہے، جس نے مجھے خود میرے اور رات کی پرچھائیوں کے سامنے حقیر کر دیا ہے، یہی وہ المناک کہانی ہے، جس نے میری زبان اور ہاتھوں کو جکڑ کے مجھے اس حالت میں کھڑا کر دیا ہے کہ نہ میرے پاس عزم و ارادہ ہے نہ عمل۔

لوگ مجھے کہتے ہیں :۔

"تمہارے ملک کی بربادی کیا ہے، سوائے دنیا کی بربادی کے ایک حقیر حصّہ کے، اور وہ اشک و خون جو تمہارے ملک میں بہا، کیا ہے سوائے اس جوئے اشک و خوں کے چند قطروں کے، جو دن رات کرۂ ارض کے میدانوں اور وادیوں سے پھوٹتی رہتی ہے!"

سچ ہے! لیکن میرے ملک کی بربادی، خاموش بربادی ہے! میرے

ملک کی بربادی وہ گناہ ہے، جس کے نتیجہ میں سانپ اور اژدہے پیدا ہوتے ہیں، میرے ملک کی بربادی وہ ٹریجڈی ہے جس میں نغمے ہیں نہ مناظر!!!

اگر میری قوم بے ایمان دغاباز حاکموں کے خلاف بغاوت کرتی اور سرکشی کے جرم میں ماری جاتی تو میں کہتا کہ آزادی کی راہ میں مرنا، غلامی کے سائے میں جینے سے بہتر ہے۔ اور جو شخص ہاتھ میں تلوار لئے موت سے گلے ملتا ہے، وہ حق کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔"

اگر میرا وطن قومی جنگ میں حصہ لیتا اور اس کا ایک ایک بچہ میدان جنگ میں کام آجاتا تو میں کہتا کہ میری قوم ایک تند و تیز آندھی ہے، جو اپنی قوت سے سبز اور خشک ٹہنیوں کو ایک ساتھ توڑ پھینکتی ہے، اور طوفانی شاخوں میں دب کر مر جانا، بڑھاپے کی آغوش میں مرنے سے بہتر ہے۔"

اگر دنیا میں کوئی زبردست زلزلہ آتا جس کے اثر سے میرا ملک بالکل اُلٹ جاتا اور میرے عزیز و آشنا مٹی میں دب جاتے، تو میں کہتا "یہ مخفی قوانین ہیں، جن کو حرکت میں لانے کی ذمہ دار وہ قوت ہے، جو انسانی قوتوں سے ارفع و اعلیٰ ہے، اس لئے جہالت ہوگی اگر ہم اس کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

لیکن میرے عزیز و اقارب بغاوت کے جرم میں نہیں مرے، آزادی کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے ہلاک نہیں ہوئے، اُن کا ملک زلزلہ نے تباہ نہیں کیا، بلکہ وہ غلامی کے گناہ میں مارے گئے۔

میرے رشتہ دار سولی پر چڑھا دیئے گئے!

وہ مرے اور اس حالت میں کہ اُن کے ہاتھ دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے اور آنکھیں فضا کی تاریکی پر جمی ہوئی تھیں!

وہ مرے اور بے زبانی و خاموشی کے عالم میں مرے اس لئے کہ انسانیت کے کان اُن کی چیخ پکار کی طرف سے بند تھے۔

وہ مرے اس لئے کہ اپنے دشمنوں سے بزدلوں کی طرح محبت اور اپنے چاہنے والوں سے بے دینوں کی طرح نفرت نہ کر سکے۔

وہ مرے اس لئے کہ گنہ گار نہ تھے۔

وہ مرے اس لئے کہ انہوں نے ظالموں پر ظلم نہیں کیا

وہ مرے اس لئے کہ امن پسند تھے۔

وہ مرے اور اس سرزمین پر بھوکے مرے، جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی رہیں۔

وہ مرے اس لئے کہ جہنمی اژدہے اُن کے کھیتوں کے سارے مویشی اور مودی خانوں کا سارا اناج ہڑپ کر گئے۔

وہ مرے اس لئے کہ سانپوں ــــ پشتینی سانپوں ــــ نے اُس فضا کو اپنی پھنکاروں سے مسموم کر دیا، جو چنبیلی گلاب اور صنوبر کی خوشبوؤں سے معطر تھی۔

اے اہلِ شام میرے اور تمہارے عزیز و اقارب مر گئے، بتاؤ اب ہم اُن کے ساتھ کیا کر سکتے ہیں، جو موت کے چنگل سے بچ گئے ہیں؟

ہماری آہیں اُن کے دم واپسیں کو نہیں روک سکیں اور ہمارے

آنسو اُن کی شدید پیاس نہیں بجھا سکتے!

تو پھر ہم اُنہیں بھوک اور پیاس سے کیسے نجات دلائیں؟

کیا ہم شک و تردد اور غفلت اور بے پروائی کے عالم میں، اس المناک حادثہ کی طرف سے آنکھیں بند کئے، زندگی کے حقیر اور معمولی کاموں میں مصروف رہیں؟

اے میرے شامی بھائی! وہ جذبہ، جو تجھے اپنے لب گور بھائی کی امداد کے لئے ابھارتا ہے ایک عدیم المثال امتیاز ہے، جو تجھے دن کی روشنی اور رات کی خاموشی سے لطف اندوز ہونے کا مستحق بناتا ہے۔

اور وہ روپیہ جو تو اپنی طرف پھیلے ہوئے خالی ہاتھ پر رکھتا ہے، ایک سنہری حلقہ ہے جو تیری انسانیت کو ماورائے انسانیت سے ملاتا ہے!

رات کی تاریکیوں میں

رات کی تاریکیوں میں ہم ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔

رات کی تاریکیوں میں ہم چلتے ہیں، فریاد کرتے ہیں اور موت کا سایہ ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ اس کے سیاہ بازو ہم پر چھائے ہوتے ہیں اور اس کا خوفناک ہاتھ ہماری روحوں کو جہنم کی طرف گھسیٹتا ہے۔ لیکن اس کی آتشیں نگاہیں، دور افق پر جمی ہوتی ہیں۔

رات کی تاریکیوں میں موت گرم رفتار ہوتی ہے، اور ہم خوف و دہشت سے آہ وزاری کرتے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں، ہم میں کوئی نہیں ہوتا جو ٹھہر سکے، یا جس کے دل میں ٹھہرنے کی آرزو ہو۔

رات کی تاریکیوں میں موت ہمارے آگے آگے ہوتی ہے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے، جب کبھی وہ پلٹ کر دیکھتی ہے، ہم میں سے ہزاروں سڑک کے کنارے گر پڑتے ہیں۔ جو گر جاتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے کہ پھر کبھی نہیں اٹھتا، اور جو نہیں گرتا وہ اپنے ارادوں کے خلاف چلتا رہتا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ وہ گرے گا اور سونے والوں کے

ساتھ سوئے گا۔ لیکن موت؟ ــــ وہ دور اُفق پر نگاہیں جمائے چلتی رہتی ہے
رات کی تاریکیوں میں بھائی اپنے بھائی کو، باپ اپنے بیٹوں کو، اور ماں اپنے بچوں کو پکارتی ہے اور ہم سب کے سب بھوکے پیاسے اور تھکے ماندے ہوتے ہیں، لیکن موت، نہ بھوکی ہوتی ہے، نہ پیاسی، اس لئے کہ اس کی غذا کا سامان ہماری روح اور جسم اور اس کی پیاس کا سامان ہمارے آنسو اور خون ہیں۔ پھر بھی اس کا پیٹ اچھی طرح بھرتا ہے، نہ پیاس بجھتی ہے۔

رات کے ابتدائی حصّہ میں بچّہ ماں کو پکار کر کہتا ہے:

"اماں مجھے بھوک لگ رہی ہے"

اور ماں جواب دیتی ہے:

"بیٹا! تھوڑی دیر صبر کر!!"

آدھی رات کو بچّہ پھر ماں کو آواز دیکر کہتا ہے۔

"اماں میں بھوکا ہوں، مجھے روٹی کھلا دو!"

اور وہ جواب میں کہتی ہے۔

"بیٹا! میرے پاس روٹی نہیں ہے!"

پچھلی رات کو موت، ماں اور اس کے بچّہ کے پاس سے گذرتی ہے اور اپنے ہاتھوں سے ان کے چپت رسید کرتی ہے، وہ سڑک کے کنارے سو جاتے ہیں، لیکن موت، دور اُفق پر نگاہیں جمائے چلتی رہتی ہے۔

صبح کو مرد رزق کی تلاش میں کھیت کی طرف جاتا ہے، لیکن وہاں خاک اور پتھر کے سوا کچھ نہیں پاتا۔

دوپہر کو وہ تھکا ماندہ خالی ہاتھ اپنے بیوی بچوں کے پاس آجاتا ہے اور جب شام ہوتی ہے تو موت مرد اور اس کے بیوی بچوں کے پاس سے گذرتی ہے، اور انہیں سوتا ہوا دیکھکر خوش ہوتی ہے، اور پھر دور اُفق پر نگاہیں جمائے چلی جاتی ہے۔

صبح کو کسان اپنی جھونپڑی سے نکلتا ہے اور اپنی ماں بہنوں کا گہنا لیکر شہر میں جاتا ہے، کہ اُسے فروخت کر کے گیہوں خریدے، لیکن جب سہ پہر کو وہ ایسی حالت میں کہ اس کے پاس سامان خورد و نوش ہوتا ہے نہ گہنا، اپنے گاؤں واپس آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ماں بیٹیاں سو رہی ہیں، مگر اُن کی نگاہیں ایک موہوم نقطہ پر جمی ہیں، اُس پرندہ کی طرح جسے صیاد کے تیر نے گرالیا ہو، وہ اپنے بازو کبھی آسمان کی طرف اٹھاتا ہے کبھی زمین کی طرف گراتا ہے، شام کو موت، کسان اور اُس کی ماں بہنوں کے پاس سے گذرتی ہے اور انہیں سوتا دیکھکر مسکراتی ہے پھر دور اُفق پر نگاہیں جمائے چلی جاتی ہے۔

رات کی تاریکیوں میں ہے— اور رات کی تاریکیوں کی کوئی مدضایت نہیں ہے —— اے روشنی میں چلنے پھرنے والو! ہم تمہیں پکارتے ہیں۔ لیکن کیا تم ہماری پکار سنتے ہو؟

ہم نے اپنے مردوں کی روحوں کو پیغامبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا،

لیکن جو کچھ انہوں نے کہا، کیا وہ تمہارے دماغوں میں محفوظ ہے؟
ہم نے مشرقی ہواؤں کو اپنے انفاس سے گراں بار کیا، لیکن کیا وہ ہوائیں تمہارے دور دراز ساحلوں تک پہنچیں اور انہوں نے اپنا بھاری بوجھ تمہارے سامنے رکھا؟

کیا تم نے ہماری مصیبت کا اندازہ کر کے ہمیں اُس سے نجات دلانے کی کوشش کی؟ یا خود کو امن و سلامتی میں پا کر کہہ دیا

"روشنی کے رہنے والے ظلمت زادوں کے ساتھ اس کے سوا اور کیا سلوک کر سکتے ہیں کہ مُردوں کو بلائیں اور انہی سے کہیں کہ اِن چلتی پھرتی لاشوں کو دفن کر دو، تاکہ مشیتِ الٰہی کی تکمیل ہو جائے!"
تاکہ مشیتِ الٰہی کی تکمیل ہو جائے!"

لیکن کیا تم اپنے تئیں موجودہ سطح سے بلند نہیں کر سکتے، تاکہ خدا تم کو اپنی مشیت بنا لے اور تم ہمارے معاون و مددگار ہو جاؤ؟

رات کی تاریکیوں میں ہم ایک دوسرے کو پکارتے ہیں!
رات کی تاریکیوں میں بھائی اپنے بھائی کو، ماں اپنے بیٹے کو، شوہر اپنی بیوی کو اور عاشق اپنی محبوبہ کو پکارتا ہے، اور جب ہماری آوازیں آپس میں گھل مل کر فضا کے جگر کی طرف بلند ہوتی ہیں تو موت ایک لمحہ کے لئے ٹھہر کر ہم پر ہنستی ہے اور ہمارا مذاق اُڑاتی ہے، پھر دور اُفق پر نگاہیں جمائے چلی جاتی ہے!

عید کی شام

شام ہوئی اور سارے شہر پر تاریکی چھا گئی، عالیشان عمارتیں اور حویلیاں برقی قمقموں سے جگمگا اٹھیں، اور لوگ عید کے نئے کپڑوں میں ملبوس سڑکوں پر نکل آئے، ان کے چہرے مسرت و اطمینان سے روشن تھے اور منہ سے شراب و کباب کی بو آ رہی تھی۔

لیکن میں اس تمام چیخ پکار، اور بھیڑ بھڑکا سے دور، یکہ و تنہا، اس شخصیت پر غور کر رہا تھا، جس کی یاد میں عید منائی جاتی ہے۔

اس فخرِ زمانہ کے متعلق سوچ رہا تھا، جو غریبی و بیچارگی کے عالم میں پیدا ہوا، زندگی بھر تجرّد سے ہمکنار رہا اور بالآخر سولی پر چڑھا دیا گیا۔

اس آتشیں شعلہ پر اپنی فکر صرف کر رہا تھا، جسے دستِ قدرت نے شام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بھڑکایا اور وہ یکے بعد دیگرے، مختلف تمدنوں کی مسافت طے کرتے ہوئے زمانے کے ارد گرد منڈلانے لگا

میں باغِ عام میں پہنچا اور ایک لکڑی کی بنچ پر بیٹھ کر، بے برگ و بار درختوں میں سے، ان سڑکوں کو دیکھنے لگا، جو آدمیوں سے پٹی پڑی

تھیں، اور دور سے اُن نزالوں کو سُننے لگا، جو ایک بے فکر اور پرمسرت جلوس کی شکل میں، عید کی خوشیاں منانے والے الاپ رہے تھے،

ایک گھنٹہ اپنے افکار میں گم رہنے کے بعد، میں نے مڑکر دیکھا، ایک شخص میرے برابر بنچ پر بیٹھا، لکڑی سے زمین پر ٹیڑھی سیدھی لکیریں کھینچ رہا تھا........ میں نے اپنے دل میں کہا:۔

"یہ بھی میری طرح تنہائی پسند معلوم ہوتا ہے!"

اور اس کے چہرے کو نہایت غور سے دیکھنے لگا۔ پھٹے پرانے کپڑوں اور لمبی لمبی اُلجھی ہوئی جٹاؤں کے باوجود اُس کے سراپا سے جلال و وقار ٹپکا پڑ رہا تھا۔

اب اس نے میری طرف دیکھا، اس طرح گویا محسوس کر لیا ہے کہ میں اس کے چہرے اور خدوخال کو نہایت غور سے دیکھ رہا ہوں، عمیق و پرسکون لہجے میں اُس نے مجھ سے کہا:

"شب بخیر!"

"شب بخیر!" میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد وہ پھر زمین پر لکیریں کھینچنے لگا اور میں اُس کی نغمہ آفریں آواز کے سحر سے تھوڑی دیر مسحور رہ کر، پھر اس سے ہم کلام ہوا:۔

"کیا آپ اس شہر میں اجنبی ہیں؟"

اُس نے جواب دیا:

"ہاں اور اسی شہر پر کیا موقوف ہے، میں ہر شہر میں اجنبی ہوں!"

میں نے کہا:
"خوشی کے اِن موقعوں پر لوگوں میں عام اُنس و ہمدردی کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں اور اجنبی اپنی تمام تکلیفیں اور پریشانیاں بھول کر کسی قسم اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔"

اُس نے جواب دیا:
"لیکن میں آج کے دن اور دنوں سے زیادہ اجنبی ہوتا ہوں۔"
یہ کہا اور غبار آلود فضا کو دیکھنے لگا، اُس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی، اور ہونٹ جنبش میں آ گئے، گویا فضا میں اپنے دور دراز وطن کے نقوش دیکھ رہا ہے۔

میں نے کہا:
"ایسے موقعوں پر لوگ ایک دوسرے سے مہربانی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ چنانچہ دولتمند فقیر کا خیال رکھتا ہے اور طاقتور کمزور پر رحم کھاتا ہے۔"

اُس نے جواب دیا:
"ہاں! مگر فقیر کے حال پر دولتمند کا کرم نمود و خود پرستی اور کمزور پر طاقتور کی مہربانی اظہارِ برتری کی ایک صورت ہے اور بس!"
"آپ صحیح فرماتے ہیں!" میں نے کہا: "لیکن ایک کمزور فقیر کو کیا ضرورت پڑی کہ وہ طاقت ور امیر کے ذہنی میلانات کی چھان بین کرے؟ بھوکا روٹی کا خیال کرتا ہے، اس کے متعلق کچھ نہیں سوچتا کہ آٹا کس طرح گوندھا جاتا ہے اور روٹی کس طرح پکائی جاتی ہے؟"

اُس نے جواب دیا:

"لینے والا جب کبھی سوچتا ہے، دینے والے کے ہی متعلق سوچتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ سوچے اور ایک مدّت تک سوچتا رہے!"

اس کی یہ بات سُن کر مجھے بہت تعجب ہوا، اور میں اس کی عجیب و غریب ہیئت اور پھٹے پرانے کپڑوں کے متعلق پھر کچھ سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد، میں نے اُس کی طرف دیکھا اور کہا:

"مجھے آپ ضرورتمند معلوم ہوتے ہیں، اس لئے اگر میں ایک روپیہ آپ کی خدمت میں پیش کروں تو کیا آپ قبول فرمالیں گے؟"

اس کے ہونٹوں پر غمگین تبسّم نمودار ہوا اور اُس نے جواب دیا:

"میں حاجتمند ضرور ہوں، لیکن روپیہ پیسہ کا نہیں!"

میں نے کہا:

"آخر پھر آپ کو کیا چاہیئے؟"

کہنے لگا:

"مجھے ایک ٹھکانا چاہیئے! ایک ایسی جگہ چاہیئے، جہاں میں دم لے سکوں"

"تو لیجئے!" میں نے کہا: "یہ دو روپیہ حاضر ہیں، کسی سرائے میں جاکر ایک کمرہ کرایہ پہ لے لیجئے!!"

اُس نے جواب دیا:

میں اُس شہر کی ہر سرائے میں گیا لیکن کہیں پناہ کی جگہ نہ ملی، میں نے ہر دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کسی کو اپنا دوست نہ پایا، میں ہر ہوٹل میں گیا لیکن کسی نے روٹی کا ایک ٹکڑہ تک نہ دیا

"کس قدر عجیب ہے یہ انسان! کبھی تو فلسفیوں کی سی باتیں کرتا ہے اور کبھی دیوانوں کی سی۔"

لیکن "دیوانہ" کا لفظ ابھی میرے ذہن میں اچھی طرح واضح بھی نہ ہوا تھا، کہ اُس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پہلے سے زیادہ بلند آواز میں کہا:

"ہاں! میں دیوانہ ہوں اور میری طرح ہر وہ شخص دیوانہ ہے، جو پردیسی ہو اور اُسے کوئی ٹھکانہ میسّر نہ ہو، جو بھوکا ہو اور اُسے روٹی کا ایک ٹکڑا نہ ملتا ہو!!"

میں نے معافی چاہتے ہوئے تلافی کے طور پر کہا:

"میری بدگمانیوں کو معاف فرمائیے! میں نہیں جانتا، آپ کون ہیں؟ آپ کی گفتگو نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے، کیا آپ میری دعوت قبول فرماکر، میرے ہمراہ چلیں گے اور آج کی رات غریب خانہ پر آرام فرمائیں گے؟!"

اُس نے جواب دیا:

"میں نے ہزار مرتبہ تمہارا دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن تم نے ایک دفعہ شنوائی نہ کی!"

مجھے اس کی دیوانگی کا یقین ہو گیا اور میں نے کہا۔

"خیر! اب تشریف لے چلئے اور آج کی رات غریب خانہ پر آرام فرمائیے!"

سر اُٹھا کر اُس نے کہا۔

"اگر تم جانتے .. کہ میں کون ہوں ؟ تو کبھی مجھے دعوت نہ دیتے !"

"کون ہیں آپ ؟" میں نے پوچھا۔

اتھاہ پانی کی گڑگڑاہٹ سے ملتے جلتے لہجہ میں اُس نے جواب دیا :

"میں وہ انقلاب ہوں جو قوموں کی فنا کردہ چیزوں کو پھر سے زندہ کرتا ہے ! میں وہ طوفان ہوں، جو زمانہ کے خود ساختہ بتوں کو اکھاڑ پھینکتا ہے ! میں وہ ہوں، جو زمین پر امن و سلامتی کے لئے نہیں، قتل و غارتگری کے لئے آیا ہے !"

وہ تن کر کھڑا ہو گیا، اس کا چہرہ چمک اٹھا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے، اُس کی ہتھیلی پر میخوں کے نشانات نمایاں ہوئے۔ میں فوراً اُس کے قدموں پر گر پڑا اور چلایا !

"مسیح ناصری ......!"

میں نے سنا، وہ کہہ رہا تھا :

"دنیا میرے نام پر عید مناتی ہے ، ان رسموں کے زیر اثر، جو زمانہ نے میرے نام کے ارد گرد قائم کر دی ہیں، لیکن میں اجنبی ہوں، دنیا کے مشرق و مغرب میں مارا مارا پھرتا ہوں، اور کسی گروہ میں کوئی آدمی ایسا نہیں جو میری حقیقت کو پہچانتا ہو !

لومڑیوں کے لئے بھٹ ہیں اور پرندوں کے لئے گھونسلے ، لیکن ابن آدم کے لئے سر چھپانے کی جگہ نہیں !"

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ دھوئیں کے ستونوں کے سوا مجھے کچھ نظر نہ آیا

نہ ابدیت کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی صدائے شب کے سوا کچھ
سُنائی دیا۔

قہرمانی قوتیں

روشنائی سے لکھنے والا، خونِ دل سے لکھنے والے کی برابری نہیں کر سکتا۔

اور وہ خاموشی، جو ناکامی و اُداسی کی ترجمان ہے اُس خاموشی کی ہم مرتبہ نہیں ہو سکتی، جو رنج و غم کی تخلیق کرتی ہے۔

میں نے خاموشی اختیار کر لی، اس لئے کہ دُنیا کے کان کمزوروں کی آہ و زاری سے ہٹ کر، دوزخ کی چیخ و پکار پر لگ گئے، اور دانائی اسی میں ہے کہ جب ضمیر وجود میں چھپی ہوئی قوتیں ——— وہ قوتیں جن کی زبان، تو ہیں ہیں اور الفاظ بم کے گولے ——— بر سر تکلم ہوں تو کمزور خاموش ہو جائے!

ہم آج کل اُس زمانہ میں ہیں، جس کا چھوٹے سے چھوٹا حصّہ، اپنے پیش رو زمانہ کے بڑے سے بڑے حصّہ سے بڑا ہے، اس لئے وہ اُمور جن میں ہمارے افکار، میلانات اور جذبات اُلجھے رہتے تھے

ایک گوشہ میں سمٹ کر رہ گئے ہیں اور وہ مشکلات و مسائل، جو ہمارے عقیدوں اور اصولوں سے کھیلتے تھے، نسیان و فراموشی کے پردہ میں چھپ گئے ہیں۔

رہے وہ لطیف خیالات اور دلکش سائے جو ہمارے محسوسات کے اسٹیج پر رقصاں تھے، سو وہ کہر کی طرح فضا میں منتشر ہو گئے ہیں، اور اُن کی جگہ اُن قہرمانی قوتوں نے لے لی ہے، جو اندھیوں کی طرح چلتی، سمندروں کی طرح اُبلتی اور کوہِ آتش فشاں کی طرح سانس لیتی ہیں لیکن ان قہرمانی قوتوں کا مقابلہ ختم ہو جانے کے بعد، دُنیا کس طرف جائے گی؟

کیا کسان اپنے اُس کھیت میں واپس آکر کھیتی باڑی کرے گا، جہاں موت نے مقتولوں کی کھوپریاں بوئی ہیں؟

کیا چرواہا اپنے گلے کو اُس چراگاہ میں چرائے گا، جس کی زمین پر تلواروں نے جگہ جگہ شگاف ڈالدئے ہیں؟ کیا وہ اپنے ریوڑ کو اُن چشموں کے کنارے لے جائے گا، جن کے پانی میں تازہ تازہ خون شامل ہے۔

کیا عابد اُس ہیکل میں نمازِ عبودیت ادا کرے گا، جہاں شیطان ناچ رہے ہیں، کیا شاعر اپنا قصیدہ اُن ستاروں کے سامنے پڑھے گا، جنھیں دھوئیں نے چھپا رکھا ہے؟ کیا مغنی اُس رات میں اپنے گیت سنائے گا، جس کی خاموشی ہولناکیوں سے گلے مل رہی ہے؟

کیا ماں اپنے شیر خوار بچّہ کے پنگورہ کے پاس بیٹھکر اُسے لوریاں دیگی اور آنے والے دن کی خوفناکیوں سے لرزہ براندام نہ ہوگی ؟

کیا عاشق اپنی محبوبہ سے ملے گا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پیار کریں گے، جہاں دشمن اپنے دُشمن کے مقابلہ پر آکر، معرکہ آرا ہو چکا ہے؟

کیا بہار دنیا میں پھر آئے گی اور اس کے زخمی جسم پر اپنی سبز چادر ڈالے گی ؟

کاش میں جانتا کہ کیا بہار اس دنیا میں پھر آئے گی ؟

میرے اور تمہارے ملک کا انجام کیا ہوگا ؟ اور وہ کونسی قہرمانی قوّت ہے جو اُن ٹیلوں اور پہاڑوں پر ہاتھ رکھے گی، جنھوں نے ہمیں مرد اور عورت بنا کر، اس دُنیا میں نمودار کیا !

کیا شام اسی طرح بھیڑیوں کے غاروں اور خنزیروں کی باڑوں میں پڑا رہے گا، یا ہم آندھیوں کے ساتھ شیر کے بن اور عقاب کے بلند مسکن کی طرف جائیں گے ؟

کیا لبنان کی چوٹیوں پر صبح کا ستارہ طلوع ہوگا ؟

جب کبھی مجھے تنہائی نصیب ہوتی ہے تو میں اپنے نفس سے یہ سوالات کرتا ہوں، مگر نفس قضاؤ قدر کی طرح دیکھتا سب کچھ ہے بولتا نہیں ۔ چلنا ضرور ہے، پلٹ کر نہیں دیکھتا، اس کی نگاہیں روشن ہیں اور قدم گرم رفتار، لیکن اس کی زبان جکڑی ہوئی ہے !

لوگو! تم میں کون ہے، جو شب و روز اپنے نفس سے یہ سوال نہیں کرتا کہ "جب قہرمانی قوتیں، اپنے چہروں پر بیواؤں اور یتیموں کے آنسوؤں کی نقاب ڈال لیں گی تو اس وقت دنیا اور دنیا والوں کا حشر کیا ہوگا؟"

میں نشو و ارتقا کی سنت کا قائل ہوں اور میرا نظریہ ہے کہ یہ سنت وجودِ ظاہری کے ساتھ وجودِ معنوی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، چنانچہ جب مخلوق مناسب سے مناسب تر کی منزل میں آتی ہے تو مذہب اور حکومت بھی خوب سے خوب تر ہو جاتے ہیں۔ اور اس بنیاد پر اس سنت کی رجعت بھی ظاہری ہے، اور انحطاط بھی سطحی۔

سنت ارتقا کی بہت سی راہیں ہیں، جو باعتبار فرع ایک دوسرے سے مختلف سہی، لیکن باعتبار اصل ایک ہیں، اس کا ظاہری پہلو بہت بے رحم اور تاریک ہے، جس سے محدود عقلیں انکار کرتی ہیں، اور کمزور دل بغاوت، لیکن اس کا باطنی پہلو عادل اور روشن ہے، اُس حق سے چمٹا ہوا ہے، جو افراد کے حقوق سے بلند ہے، اُس غرض پر نگاہیں جمائے ہوئے ہے، جو جماعت کی اغراض سے اعلیٰ ہے، اُس آواز پر کان لگائے ہوئے ہے، جو غمزدوں کی آہوں اور غمگینوں کی سسکیوں کو اپنے خوف اور شیریں میں جذب کر لیتی ہے۔

میرے گرد و پیش، ہر جگہ وہ لوگ ہیں جو دور سے جنگ آزما قہرمانی قوتوں کی پرچھائیوں کی پرچھائیاں دیکھتے ہیں، سوتے ہیں

اُن کے نعرہ ہائے مسرت کی صدائے بازگشت کی سنتے ہیں
اور مینڈکوں کی طرح چلاتے ہیں:

"دنیا اپنی ابتدائی فطرت کی طرف لوٹ گئی، قوموں نے اپنے علم وفن کی مدد سے جو کچھ بنایا تھا، اُسے وحشی انسان کی حرص و انانیت نے ڈھا دیا، چنانچہ آج ہمارا وہی حال ہے، جو غاروں میں رہنے والے انسان کا تھا۔ آج اگر ہمیں اُن سے کوئی چیز ممتاز کرتی ہے تو وہی آلات، جو ہم نے تباہی کے لیے ایجاد کیے ہیں، یا پھر وہ حکمت و تدبیر، جسے ہم ہلاکت کے لیے کام میں لاتے ہیں"

یہ بات وہ لوگ کہتے ہیں جو عالم کے ضمیر کو اپنے ضمیروں کی ترازو میں تولتے ہیں اور ہستی کی غایت کے تجزیہ کے لیے اس کوتاہ عقل سے کام لیتے ہیں، جسے وہ اپنے وجودِ شخصی کی حفاظت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ گویا آفتاب صرف اس لیے ہے کہ انھیں حرارت پہنچائے اور سمندر صرف اس لیے کہ وہ اس میں اپنے پاؤں دھوئیں۔

زندگی کے سینے سے، محسوسات کے پیچھے سے، نظامِ ہستی کی گہرائیوں سے، جہاں اسرارِ وجود پوشیدہ ہیں، قہرمانی قوتیں ہوا کی طرح اُبھریں، بادلوں کی طرح بلند ہوئیں اور پہاڑوں کی طرح آپس میں مل گئیں۔ اب وہ برسرِ پیکار ہیں، دنیا کی اُن مشکلات کو حل کرنے کے لئے، جو تباہی و بربادی کے بغیر کبھی حل نہیں ہو سکتیں۔

لیکن انسان، اُس کے علوم و فنون، اُس کی محبت و نفرت اور اس کا صبر و اضطراب اور درد و بے چینی، یہ سب وہ آلات ہیں، جنہیں قہرمانی قوتیں، اس مقصد اعلیٰ کو حاصل کرنے کا ذریعہ بناتی ہیں، جس تک پہنچنا ضروری ہے۔

رہا وہ خون، جو بہایا گیا سو وہ کوثر کی نہریں بن کر پھوٹے گا، رہے وہ آنسو، جو بکھیرے گئے، سو وہ خوشبودار پھول بن کر اُگیں گے، رہیں وہ جانیں، جو ضائع کی گئیں، سو وہ ایک جگہ جمع ہو کر، نئی صبح کی شکل میں نئے افق سے طلوع ہوں گی اور اس وقت انسان کو معلوم کو ہو گا کہ اس نے حق کو ابتلاء کے بازار سے خریدا ہے، ہاں! وہ سمجھ لے گا کہ حق کی راہ میں خرچ کرنے والا کبھی ٹوٹے میں نہیں رہتا!

لیکن بہار؟ —— بہار ضرور آئے گی! مگر جو کوئی اس کا تحفہ سرمائی ہاتھوں سے لینے پر تیار نہ ہو گا وہ ہمیشہ اس سے محروم رہے گا!!

قانونِ فطرت

کتنا عجیب ہے زمانہ اور کتنے عجیب ہیں ہم!

زمانہ بدلا اور اپنے ساتھ ہمیں بھی بدل گیا۔ اس نے ہماری رہنمائی کی اور ہم اس کے ساتھ ساتھ ہو لئے۔ اس نے اپنے چہرے سے نقاب اُلٹی اور ہم سب کچھ بھول کر ہمسرت در آغوش ہو گئے!

کل تک ہم زمانے سے ڈرتے اور اس کی شکایت کرتے تھے، لیکن آج اس کے دوست ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں، بلکہ اس کی فطرت و غائیت اور اسرار و رموز کو سمجھنے لگے ہیں۔

کل تک ہم بچتے بچاتے، چھپتے چھپاتے رینگتے تھے، اُن پرچھائیوں کی طرح، جو رات کی ہول آفرینیوں اور دن کی خوفناکیوں کے درمیان لرزتی کانپتی ہیں، لیکن آج اُن کوہستانی راہوں میں دندناتے پھرتے ہیں جو تند و تیز آندھیوں کی کمین گاہیں اور برق و رعد کا سرچشمہ ہیں۔

کل تک ہم خون سے گندھی ہوئی روٹی کھاتے اور آنسو ملا پانی پیتے تھے۔ لیکن آج صبح پریوں کے ہاتھ سے من و سلویٰ کھاتے اور بہار کی

عطر بیزیوں سے معطر شراب پیتے ہیں۔

کل تک ہم تقدیر کے ہاتھ کا کھلونا تھے اور تقدیر، طاقت و قوت کے نشہ میں چور، ہمیں جس طرح چاہتی، نچاتی تھی، لیکن آج جب کہ اس کا نشہ اتر چکا ہے، ہم اس کے ساتھ کھیلتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ کھیلتی ہے، ہم اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں اور وہ ہنستی ہے، ہم اس کی قیادت کرتے ہیں اور وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔

کل تک ہم بتوں کے سامنے خوشبوئیں سلگاتے اور غضب ناک دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھاتے تھے لیکن آج اپنی روح کے سوا، کسی کے سامنے خوشبوئیں نہیں سلگاتے اور اپنی ذات کے سوا، کسی پر بھینٹ نہیں چڑھاتے، اس لئے کہ سب سے بڑے اور سب سے حسین دیوتا نے ہمارے سینہ کو اپنی جلوہ گاہ بنالیا ہے۔

کل تک ہم بادشاہوں سے ڈرتے تھے اور ہماری گردنیں ان کے سامنے خم ہو جاتی تھیں، لیکن آج حق کے سوا، کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتے، حسن کے سوا، کسی کی اطاعت نہیں کرتے اور محبت کے سوا کسی کے آرزومند نہیں ہوتے۔

کل تک ہماری نگاہیں پادری کے چہرہ پر نہ پڑ سکتی تھیں اور ہم نجومیوں کو دیکھتے، خوف محسوس کرتے تھے لیکن آج جب کہ زمانہ اور زمانہ کے ساتھ ہم بدل چکے ہیں، سورج کے سوا، کسی پر نگاہیں نہیں جماتے، سمندر کے نغمہ کے سوا کوئی آواز نہیں سنتے اور بگولوں کے سوا، کسی کے ساتھ جنبش نہیں کرتے۔

کل تک ہم اپنی روح کے محل ڈھاتے تھے تاکہ ان کی بنیادوں پر

اپنے آباؤ اجداد کی قبریں تعمیر کریں، لیکن آج ہماری روح مقدس قربانگاہ ہے، جس کے قریب، گزرے ہوئے زمانہ کی پرچھائیاں آسکتی ہیں نہ اسے موت کی بوسیدہ انگلیاں چھو سکتی ہیں

ہم نسیان و فراموشی کے گوشوں میں چھپی ہوئی، خاموش فکر تھے لیکن اب بلند آواز ہیں جو فضا کی گہرائیوں میں لرزش پیدا کر دیتی ہے۔

ہم راکھ میں دبی ہوئی چھوٹی سی چنگاری تھے، لیکن اب بھڑکتی ہوئی آگ ہیں جس نے وادیوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔

ہم نے کتنی راتیں گم شدہ محبت اور ضائع کردہ رزق کے لئے روتے ہوئے جاگ کر کاٹی ہیں، اس طرح کہ زمین ہمارا بستر تھی اور برف ہمارا لحاف! ہم نے کتنے دن بیٹھے بیٹھے گزارے ہیں، بھیڑوں کے اس ریوڑ کی طرح جس کا چرواہا نہ ہو اور اس حالت میں کہ ہم اپنے افکار کو دانتوں سے توڑتے اور اپنے جذبات کو ڈاڑھوں میں چباتے تھے، لیکن پھر بھی بھوکے کے بھوکے اور پیاسے کے پیاسے ہی رہتے تھے! ہم کتنی مرتبہ دونوں وقت ملتے کھڑے ہوئے ہیں، اس عالم میں کہ شباب رفتہ کا ماتم کرتے تھے، ایک انجان چیز کی تمنا میں جان دیتے تھے، نامعلوم اسباب کی بنا پر وحشت زدہ ہوتے تھے، خالی اور تاریک فضا کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے تھے اور سکون و نیستی کی آہ و فغاں پر کان لگاتے تھے۔

لیکن وہ زمانہ گزر گیا جس طرح بھیڑیا قبرستان سے گزر جاتا ہے اور آج، جب کہ فضا بھی صاف ہے اور ہم بھی صحت مند، ہم اپنی روشن راتیں شاندار مسہریوں پر گزارتے ہیں، اس طرح کہ خیال کے ساتھ جاگتے ہیں، فکر کے ساتھ باتیں کرتے ہیں اور امیدوں سے گلے ملتے ہیں، ہمارے اردگرد آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں اور ہم انھیں اپنی غیر مرتعش انگلیوں سے پکڑ لیتے ہیں۔ ہر طرف جنوں کے سائے نمودار ہوتے ہیں اور ہم ان سے غیر مشتبہ زبان میں گفتگو کرتے ہیں، فرشتوں کے گروہ ہمارے پاس سے گزرتے ہیں اور ہم انھیں اپنے دل کے شوق سے لبھاتے اور اپنی روح کے نغموں سے مخمور کرتے ہیں۔

ہم کل یہ تھے اور آج یہ ہیں اور یہی اپنی اولاد کے متعلق دیوتاؤں کی مرضی ہے! لیکن اب تمہارا ارادہ کیا ہے؟ اے ابلیس زادو!
جب سے تم زمین کے شگافوں سے نمودار ہوئے ہو، ایک قدم بھی تم نے آگے کی طرف بڑھایا؟ جب سے شیطانوں نے تمہاری آنکھیں کھولی ہیں، کبھی بلندی کی طرف تم نے نگاہ اٹھا کر بھی دیکھا؟ جب سے سانپوں کی پھنکار نے تمہارے ہونٹ چومے ہیں، حق کی راہ میں ایک کلمہ بھی تم نے اپنی زبان سے نکالا؟ جب سے موت نے تمہارے کانوں میں روئی ٹھونسی ہے، ایک لمحے کے لئے بھی تم نے زندگی کے نغمہ پر کان لگائے؟

...... ستر ہزار برس پہلے میں نے تمہیں دیکھا، تو اس وقت بھی تم کیڑے مکوڑوں کی طرح غاروں کے گوشوں میں رینگ رہے تھے اور اب اتنی طویل مدت کے بعد، سات منٹ ہوئے کہ میں نے اپنی کھڑکی کے شیشہ میں سے تم پر نگاہ ڈالی، سو اب بھی تم ناپاک گلیوں میں مارے مارے پھر رہے ہو، گمنامی کے شیطان تمہاری رہنمائی کر رہے ہیں، غلامی کی بیڑیاں تمہارے پاؤں میں پڑی ہیں اور موت تمہارے سروں پر منڈلا رہی ہے!

تم آج بھی وہی ہو، جو کل تھے اور کل اور اس کے بعد بھی ویسے ہی رہو گے، جیسا میں نے شروع میں تمہیں دیکھا تھا!

لیکن ہم کل یہ تھے اور آج یہ ہیں اور یہی اپنی اولاد کے متعلق دیوتاؤں کا قانون ہی!

مگر اے ابلیس زادو! تمہارے متعلق ابلیس کا قانون کیا ہی؟

عرفانِ نفس

بیروت کی ایک برشگالی رات میں سلیم آفندی اپنی میز کے پاس بیٹھا جس پر پرانی کتابوں اور کاغذوں کا انبار لگا تھا، کتابوں کی ورق گردانی کر رہا تھا، وہ کبھی کبھی سر اٹھا کر اپنے موٹے موٹے ہونٹوں سے سگریٹ کا دھواں چھوڑ دیتا تھا، اس وقت اس کے سامنے فلسفہ کی ایک چھوٹی سی کتاب تھی، جو سقراط نے اپنے محبوب شاگرد افلاطوں کے لئے "عرفانِ نفس" کے موضوع پر لکھی تھی۔

سلیم آفندی وہ نفیس کتاب پڑھ رہا تھا اور فلاسفۂ متقدمین کے وہ اقوال یاد کر رہا تھا، جو اس موضوع سے متعلق تھے، یہاں تک کہ مشرقی اور مغربی مفکرین کے تمام نظریات اس کے ذہن میں تازہ ہو گئے اور اس کی ذات 'عرفانِ نفس' کی گہرائیوں میں غرق ہو گئی۔

اچانک وہ چونکا اور انگڑائی لے کر بلند آواز میں کہنے لگا:

"ہاں! "عرفانِ نفس" ہی معارف عالیہ کا سرچشمہ ہے، اس لئے مجھ پر فرض ہے کہ میں اپنی ذات کو پہچانوں، اس کی تمام حقیقتوں سے

واقف ہوں، اس کے ہر پہلو اور ہر گوشے کو سمجھوں، مجھ پر واجب ہے کہ اسرارِ نفس سے پردہ اٹھاؤں اور اپنے دل کے بھیدوں کے متعلق جو شبہ مجھے ہے، اُسے دور کروں۔ بلکہ میرے لئے ناگزیر ہے کہ اپنے وجودِ معنوی کی غایت اپنے وجودِ ظاہری کو بتاؤں اور اپنے وجودِ ظاہری کے اسرار اپنے وجودِ معنوی پر منکشف کروں"!

یہ کلمات اس نے ایک عجیب جوش کے ساتھ ادا کئے، اس کی آنکھوں میں عرفان کی محبت عرفانِ نفس کی محبت کے شعلے بھڑک رہے تھے، اسکے بعد وہ سامنے والے کمرے میں گیا، اور آئینے کے سامنے، جو کمرے کے فرش کو چھت سے ملا رہا تھا، بت کی طرح ساکت و صامت کھڑا ہو گیا، اس کی نگاہیں اپنے عکس پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اپنے چہرے کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا اپنے سر، اپنے قد، اور اپنی مجموعی ہیئت کا اچھی طرح جائزہ لے رہا تھا۔

وہ آدھ گھنٹہ تک اسی طرح بےحس و حرکت کھڑا رہا۔ گویا ازلی فکر نے اس پر وہ افکار نازل کر دیئے ہیں، جو اپنی بلندی کی بنا پر ہولناک ہیں اور جن کے واسطے سے وہ اپنی روح کی گتھیاں سلجھا سکتا اور اپنی ذات کی خلاؤں کو روشنی سے لبریز کر سکتا ہے۔

اس نے اپنے لب وا کئے اور اپنے نفس کو مخاطب کر کے آہستہ آہستہ کہنے لگا:

"میں کوتاہ قد ہوں اور اسی طرح نپولین اور وکٹر ہیوگو بھی کوتاہ قد تھے

میری پیشانی تنگ ہے اور اسی طرح سقراط اور اسپنیوزا کی پیشانی بھی تنگ تھی
میرے سر کے اگلے حصہ کے بال اڑے ہوئے ہیں اور یہی حال شکسپیئر کا تھا۔
میری ناک لمبی اور ایک طرف جھکی ہوئی ہے اور اسی طرح سفنیر دلا والٹیر اور جارج واشنگٹن کی ناک بھی لمبی اور ایک طرف جھکی ہوئی تھی۔
میری آنکھ میں عیب ہے اور اسی طرح سینٹ پال اور نیٹشے کی بھی آنکھ میں عیب تھا۔
میرے ہونٹ موٹے اور نیچے کا ہونٹ آگے نکلا ہوا ہے اور اسی طرح سٹیرن اور لوئی چہاردہم کے بھی ہونٹ موٹے اور نیچے کا ہونٹ آگے نکلا ہوا تھا۔
میری گردن موٹی ہے اور اسی طرح ہانی بال اور مارکس انطونیو کی گردن بھی موٹی تھی۔
میرے کان لمبے اور وحشیوں کی طرح جھکے ہوئے ہیں اور اسی طرح برونو اور سروانتیز کے کان بھی لمبے اور وحشیوں کی طرح جھکے ہوئے تھے۔
میرے رخسار کی ہڈی ابھری ہوئی اور کلے پچکے ہوئے ہیں اور یہی کیفیت لافیات اور لنکن کی تھی۔
میری ٹھوڑی دھنسی ہوئی ہے اور اسی طرح گولڈ سمتھ اور ولیم پٹ کی ٹھوڑی بھی دھنسی ہوئی تھی۔
میرے کندھے اونچے نیچے ہیں اور اسی طرح گوئٹے اور ادیب اسحٰق

کے کندھے بھی اونچے نیچے تھے۔

میری ہتھیلیاں بھدی اور انگلیاں چھوٹی ہیں اور یہی حالت بالزاک اور دانتے کی تھی۔ مختصر یہ کہ میرا جسم کمزور اور دبلا پتلا ہے اور یہ ان مفکرین کی خصوصیت ہے، جنہوں نے اپنی جسمانی قوتیں، ذہنی مقاصد کے حصول میں صرف کی ہیں۔

حیرت ہے کہ بلزاک کی طرح جب تک میرے پہلو میں قہوہ کی کیتلی نہ ہو، میں لکھ پڑھ نہیں سکتا، علاوہ ازیں میکسم گورکی اور ٹالسٹائے کی طرح مجھے بھی دیوانوں اور بازاری لوگوں سے ملنے کا شوق ہے۔ یہی نہیں بلکہ بیتھوون اور ولٹ وٹمن کی طرح مجھے بھی ہاتھ منہ دھوئے دو دو دن ہو جاتے ہیں۔

ان سب سے زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ بوکاشیو اور ریبالے کی طرح مجھے بھی عورتوں کے حالات معلوم کرنے میں لطف آتا ہے۔ بالخصوص اُن کی وہ حرکات دریافت کرنے میں، جو وہ اپنے شوہروں کی غیر موجودگی میں کرتی ہیں۔

اب صرف دو سوال رہ جاتے ہیں، ایک تو یہ کہ میں شراب کا رسیا کیوں ہوں؟ اور دوسرا یہ کہ مجھے مرغن غذائیں اور انواع و اقسام کے کھانوں سے چُنے ہوئے دسترخوان کیوں پسند ہیں؟ جواب یہ ہے کہ میرا پہلا شوق ابونواس، ڈی موسہ اور مارکو کے شوق سے مشابہ ہے اور دوسرا شوق نہم پطرس اعظم اور سلطان بشیر شہابی کے

شوق سے ملتا جلتا ہے۔

سلیم آفندی تھوڑی دیر کے لئے رک گیا اور پھر اپنی پیشانی پکڑ کر کہنے لگا۔

"یہ ہوں میں، اور یہ ہے میری حقیقت، بالفاظ دیگر میں ان تمام خوبیوں کا مالک ہوں، جو تاریخ کے آغاز سے لے کر، اس زمانے تک کے بڑے بڑے آدمیوں کا طغرائے امتیاز رہی ہیں اور اس نوجوان کے لئے جس میں یہ خصوصیات موجود ہوں، ضروری ہے کہ وہ اس دنیا میں کوئی بڑا کام کرے۔

عرفانِ نفس، حکمت و فلسفہ کا مقصد اعلیٰ ہے، اور میں نے آج کی رات اپنے نفس کا عرفان حاصل کر لیا ہے۔ اس لئے میں آج ہی کی رات سے وہ عظیم الشان کام شروع کر دوں گا جس کی طرف مجھے اس عالم کی حقیقت بلا رہی ہے —— وہ حقیقت، جو مختلف اور متعدد عناصر کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے۔

میں نے نوح سے لے کر سقراط اور بوکاشیو سے لے کر احمد فارس شدیاق تک کے بڑے بڑے لوگوں کی ہمراہی اختیار کر لی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ عظیم الشان کام کیا ہے، جو میرے ہاتھوں انجام پذیر ہوگا؟ لیکن وہ مرد، جس کی شخصیت ظاہری اور ذات معنوی میں وہ تمام صفات موجود ہوں، جو مجھ میں ہیں، قطعی طور پر "معجزاتِ زمانہ" میں سے ہونا چاہیئے۔

میں نے خود کو پہچان لیا۔ ہاں! دیوتاؤں کی قسم! میں نے اپنی ذات کو پہچان لیا، اس لئے مجھے زندہ، میری ذات کو قائم اور اس

کائنات کو کائنات کی حیثیت سے اس وقت تک باقی رہنا چاہئے، جب تک میں اپنا کام ختم نہ کر لوں۔"

سلیم آفندی کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے گھناؤنے چہرہ پر مسرت کے آثار تھے اور وہ ایک ایسی آواز میں، جس کا بلند آہنگی سے وہی تعلق تھا جو بلی کی میاؤں میاؤں کو ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے ہوتا ہے ابوالعلا معرّیٰ کا یہ شعر بار بار پڑھ رہا تھا:

میں اگرچہ آخری زمانے میں پیدا ہوا ہوں
لیکن وہ کام کرونگا جو میرے پیشرو، نہ کر سکے

تھوڑی دیر کے بعد ہمارے دوست، بانیاس پریشان، اپنی جھلنگی چارپائی پر محو خواب تھے اور ان کے خراٹے فضا کو ایک ایسے نغمہ سے گراں بار کر رہے تھے، جو آدمی کی آواز کے مقابلہ میں چکّی کی گھڑگھڑاہٹ سے زیادہ قریب تھا۔

فلسفۂ اقوام

قوم ان مختلف الاخلاق، مختلف العقیدہ اور مختلف الرائے افراد کا مجموعہ ہے، جنھیں ایک معنوی رشتہ آپس میں ملاتا ہو —— وہ معنوی رشتہ جو اخلاق سے زیادہ قوی، عقیدہ سے زیادہ گہرا، اور رائے سے زیادہ عام ہے۔

کبھی وحدتِ دینی اس رشتہ کا ایک تار ہوتی ہو، لیکن یہ تار اتنا قوی نہیں ہوتا کہ دوسرے قومی رابطوں کو مضمحل کر دے۔ ہاں! اگر وہ رابطے ہی بوسیدہ اور کمزور ہوں، جیسا کہ بعض مشرقی ممالک میں پایا جاتا ہے، تو دوسری بات ہے!

کبھی وحدتِ لسانی اس رابطہ کا بنیادی سبب ہوتی ہے، لیکن بہت سی قومیں ہیں، جو ایک زبان بولتی ہیں، لیکن سیاست، نظامِ حکومت اور اجتماعی نظریات کے اعتبار سے اُن میں مستقل اختلاف ہو۔

کبھی وحدتِ دعوی اس رابطہ کی اساس ہوتی ہے، لیکن تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں، جن کے ذریعہ ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ مختلف ہم نسل قبیلے ایک دوسرے سے الگ ہوئے اور یہ علیحدگی، باہمی عداوت، لڑائی، جھگڑوں اور نتیجہ میں زوال وفنا کا سبب بن گئی۔

اور کبھی مادی مصلحت وہ تر ہوتی ہے، جس پر یہ رشتہ لپیٹا جاتا ہے لیکن بہت سے گروہ ہیں، جن کی مادی مصلحت کچھ نہیں ہوتی، سوائے نفسانیت اور مناقشوں کے۔

اچھا! تو پھر یہ قومی رابطہ کیا ہے؟ اور وہ کونسی زمین ہے، جہاں قوموں کے بت بنتے ہیں؟

قومی رابطہ کے سلسلے میں میری ایک رائے ہے، جسے بعض مفکرین اس لئے عجیب سمجھتے ہیں کہ اس کے اصول ونتائج امورِ محسوسہ سے تعلق نہیں رکھتے۔

بہر حال میری رائے یہ ہے کہ

ہر قبیلہ کا ایک "نفس اجتماعی" ہوتا ہے، جو اپنے جوہر وطبیعت کے اعتبار سے نفسِ انفرادی سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہ نفسِ اجتماعی اپنے وجود کے لئے قبیلوں کے افراد کا محتاج ہے، جس طرح درخت اپنی زندگی کے لئے پانی، مٹی، روشنی اور حرارت کا محتاج ہے، تاہم وہ قبیلوں سے الگ اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ اور اس کی ایک خاص زندگی اور ایک جداگانہ ارادہ ہوتا ہے لیکن جس طرح میری لئے

اُس زمانہ کی تحدید وتعیین دشوار ہے، جس میں نفسِ انفرادی پیدا ہوتا ہے، اسی طرح میرے لئے اس زمانہ کی تحدید وتعیین بھی مشکل ہے، جس میں نفس اجتماعی تشکیل پاتا ہے، تاہم یہ میں ضرور جانتا ہوں کہ مثلاً مصری قوم ساحلِ نیل پر ابتدائی حکومت کی بنیاد رکھے جانے سے کم ازکم پانچ سو برس پہلے نمایاں ہوئی اور اسی نفس اجتماعی سے مصر نے اپنے تمام فنی، مذہبی اور اجتماعی مظاہر میں مدد لی۔

جو کچھ میں نے مصر کے متعلق کہا ہے، وہی اشور، ایران، روم اور عرب وغیرہ کی جدید قوموں پر بھی صادق آتا ہے —— جدید قوموں سے میری مراد وہ قومیں ہیں، جو ازمنہ وسطیٰ کے بعد وجود میں آئی ہیں۔

میں نے کہا ہے اور صحیح کہا ہے کہ نفسِ اجتماعی کی ایک خاص زندگی ہوتی ہے۔ اور جس طرح ہر زندہ شے کی ایک محدود عمر ہوتی ہے، اسی طرح نفسِ اجتماعی کے لئے بھی ایک وقت ہوتا ہے، جس سے وہ تجاوز نہیں کرتا۔ اور جس طرح وجودِ شخصی بچپن سے جوانی، جوانی سے کہولت اور کہولت سے بڑھاپے کی منزل میں جاتا ہے اسی طرح نفسِ اجتماعی کا وجود بھی نیند کی نقاب سے گھبرائی ہوئی صبح کی بیداری سے، سورج کی شعاعوں سے روشن دوپہر کی بیداری سے، لباس بیزاری میں ملبوس شام کی بیداری لباس بیزاری میں ملبوس شام کی بیزاری سے، نیند کے بوجھ میں دبی ہوئی رات کی بیداری، اور نیند کے بوجھ میں دبی ہوئی رات کی بیداری سے گہری نیند کی گہرائیوں کی طرف جاتا ہے۔

یونانی قوم، ولادتِ مسیح سے ایک ہزار سال پہلے بیدار اور پانچ سو سال قبل مسیحؑ میں عظمت وجلال سے ہم کنار ہوئی لیکن مسیحؑ کا دور آیا تو بیداری کے خوابوں سے اکتا گئی اور ابدی خوابوں سے گلے ملنے کے لئے ابدیت کے بستر میں سو گئی۔

عربی قوم ظہور اسلام سے تین سو برس پہلے وجود میں آئی اور اسی زمانہ میں اُسے اپنے شخصی وجود کا احساس ہوا، یہاں تک کہ جب پیغمبرِ اسلام مبعوث ہوئے تو ایک دیو کی طرح کھڑی ہوئی، اور آندھی کی طرح ہر اس چیز کو فنا کر دیا، جو اس کے راستہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہوئی، اور جب خلفائے عباسیہ کا دور آیا تو اس ہزار پایہ تخت پر بیٹھ گئی، جس کا ایک پایہ ہندوستان میں تھا اور دوسرا اندلس میں۔ لیکن جب اس کی ترقی کا آفتاب غروب ہونے کو آیا اور مغل قوم نمایاں ہو کر مشرق سے مغرب تک پھیل گئی تو عربی قوم اپنی بیداری سے تنگ آکر سو گئی۔ لیکن اس کی نیند گہری نیند نہیں، بلکہ اوراچٹتی ہوئی نیند ہے، چنانچہ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ دوبارہ بیدار ہوگی اور ان تمام قوتوں کا مظاہرہ کرے گی، جو اس کے نفس میں چھپی رہ گئی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے رومانوی قوم، اطالوی تحریک کے زمانے میں، جو رنسانس کے نام سے مشہور ہے، دوبارہ بیدار ہوئی اور وینس، فلورنس اور میلان میں اپنے ان واجبات کی تکمیل کی جن کی ابتدا اس نے، توتونی قبائل کے حملہ سے پہلے کر دی تھی۔

تاریخ میں جتنی قومیں ملتی ہیں، ان سب سے زیادہ عجیب وغریب

قوم فرانسیسیوں کی ہے جس کو وجود میں آئے دو ہزار برس ہو گئے، لیکن وہ ابھی تک جوانی کے دلکش دور میں ہے۔ اس قوم میں آج بھی وہی فکر کی وقت، نظر کی تیزی اور علم و فن کی وسعت پائی جاتی ہے، جو اس کی تاریخ کے ہر دور میں اس کا سرمایۂ کمال تھی۔ بلکہ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ ان خصوصیات میں اس نے نمایاں ترقی کی ہے اور برابر کر رہی ہے۔

فردداں، کاآریر، شتیاں، ہیوگو، ریناں، راسد، سیمونی اور ان کے علاوہ انیسویں صدی کے تمام فرانسیسی اہلِ کمال، فن، علم اور خیال کے اعتبار سے دنیا کے ہر بڑے آدمی پر فوقیت رکھتے ہیں۔

ہمیں ایک بات یہاں اور ثابت کرنی ہے کہ بعض قوموں کی عمر، بعض قوموں کے مقابلہ میں زیادہ طویل ہوتی ہے۔ چنانچہ مصری قوم تین ہزار برس تک زندہ رہی، برخلاف اس کے یونانی قوم ایک ہزار برس سے زیادہ زندہ نہ رہ سکی۔ قوموں کی عمر کے کم یا زیادہ ہونے کے اسباب بھی وہی ہیں، جو افراد کی عمر کے کم یا زیادہ ہونے کے ہیں۔

لیکن زندگی کے اسٹیج پر اپنا پارٹ ختم کر لینے کے بعد، قوم پر کیا گزرتی ہے؟

کیا وہ آنے والی نسلوں کے لئے اپنی یاد کے سوا، کچھ اور چھوڑے بغیر، مرجاتی ہے، کیا وہ زمانہ کے ہاتھوں اس طرح پامال ہو جاتی ہے،

گویا کبھی تھی ہی نہیں ؟

میرا عقیدہ ہے کہ وجودِ معنوی متغیر ہو سکتا ہے، لیکن فنا کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ وجودِ مادّی کی طرح ایک شکل سے دوسری شکل اور ایک صورت سے دوسری صورت اختیار کرتا ہے، لیکن اس کے فطری ذرات زمانہ کے ساتھ باقی رہتے ہیں۔ اس بناء پر کسی قوم کا نفسِ اجتماعی سوتا تو ضرور ہے، لیکن پھولوں کی طرح زمین میں اپنے بیج ڈال کر، رہی اس کی روح، سو وہ عالمِ ابد کی طرف بلند ہوتی ہے اور میرے نزدیک قوم ہو یا پھول، اس کی روح —— خوشبو —— ہی تنہا حقیقت جوہرِ مطلق —— ہے! چنانچہ شبیب، بابل، نینوا، ایتھنز اور بغداد کی روح ہماری زمین کے گردتنے ہوئے اثیر کے پردے میں اب تک موجود ہے بلکہ ہماری روح کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے اور ہم —— انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے —— ہر اس قوم کی میراث ہیں، جو سطحِ زمین پر نمودار ہو چکی ہے۔ لیکن یہ مقدس میراث اس وقت تک منفرداً یا مجتمعاً کوئی محسوس صورت اختیار نہیں کر سکتی، جب تک کوئی ایسی قوم وجود میں نہ آئے، جو تمام افراد اور ساری جماعتوں کو اپنے اندر جذب کرلے اور اس طرح ایک ہمہ گیر نفسِ اجتماعی تشکیل پا جائے، جس کی خاص زندگی اور جداگانہ ارادہ ہو۔

"کلام"

میں کلام اور کلام کرنے والوں سے اکتا گیا ہوں!
میری روح کلام اور کلام کرنے والوں سے تھک گئی ہے!!
میری عقل کلام اور کلام کرنے والوں میں کھو گئی ہے!!!
صبح کو جب میں بیدار ہوا، تو میں نے دیکھا کہ کلام، میرے پلنگ کے پاس، اخبارات و رسائل پر بیٹھا، مجھے مکر و خباثت کی آنکھوں سے گھور رہا ہے۔

میں بستر سے اُٹھا اور قہوہ کی ایک پیالی سے نیند کا خمار زائل کرنے کے لئے، کھڑکی کے پاس جا بیٹھا، میرے ساتھ کلام بھی اٹھا اور چیخ پکار مچاتے ہوئے میرے سامنے ناچنے لگا۔ اس کے بعد، جب میں نے قہوہ کی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے بھی اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور میری ساتھ قہوہ پینے لگا۔ پھر جب میں نے سگریٹ سلگایا تو اس نے بھی سلگایا اور جب میں نے اُسے ختم کر کے پھینکا تو اس نے بھی پھینک دیا۔
میں کسی کام کے لئے اُٹھتا ہوں تو کلام بھی سائے کی طرح میرے

ساتھ لگا رہتا ہے، مجھ سے سرگوشیاں کرتا ہے، میرے سر کے گرد منمناتا ہے، اور میرے دماغ کی خلاؤں میں ایک ہنگامہ برپا کر دیتا ہے لیکن جب میں اُسے بھگانا چاہتا ہوں تو وہ قہقہہ مار کر ہنستا ہے اور پھر کانا پھوسی کرنے، منمنانے اور شور مچانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

میں بازار جاتا ہوں تو کلام کو ہر دوکان کے دروازہ پر کھڑا پاتا ہوں، ہر مکان کی دیواروں پر چلتے پھرتے دیکھتا ہوں، میں اسے لوگوں کے چہرہ پر دیکھتا ہوں، حالانکہ وہ خاموش ہوتے ہیں۔ میں اسے ان کی حرکات و سکنات میں پاتا ہوں، حالانکہ وہ بے خبر ہوتے ہیں اگر میں اپنے کسی دوست کے پاس بیٹھتا ہوں تو کلام ہم میں تیسرا ہوتا ہے۔ اور جب کسی دشمن سے دوچار ہوتا ہوں تو اس وقت کلام پھول کر پھیل جاتا ہے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر لشکرِ جرار کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کا ایک سرا مشرق میں ہوتا ہے اور دوسرا مغرب میں پھر جب میں اپنے دشمن کو چھوڑ کر بھاگتا ہوں تو اس کے کلام کی صدائے بازگشت میرے دماغ میں ہنگامہ پیدا کرتی رہتی ہے، جس طرح غیر منہضم غذا معدہ میں بے چینی پیدا کرتی ہے۔

میں عدالتوں، کالجوں اور مدرسوں میں جاتا ہوں تو کلام کو اس کے باپ اور بھائیوں کے ساتھ دیکھتا ہوں، وہ سب کے سب جھوٹ کی چادر اوڑھے، فریب کا عمامہ باندھے اور مکاری کے جوتے پہنے ہوتے ہیں۔

پھر میں کارخانوں، مکتبوں اور دفتروں میں جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کلام اپنی ماں، چچی اور دادی کے پہلو میں بیٹھا، اپنے موٹے موٹے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا ہے اور وہ سب کی سب کلام پر مسکرا رہی ہیں اور مجھ پر ہنس رہی ہیں

اس کے بعد بھی اگر مجھ میں صبر و ارادہ کی قوت باقی رہ جاتی ہے تو میں ہیکلوں اور عبادت گاہوں کی زیارت کے لئے جاتا ہوں، کلام وہاں بھی مجھے تخت پر بیٹھا نظر آتا ہے اس شان سے کہ سر پر تاج ہوتا ہے اور ہاتھوں میں نہایت عمدہ اور بیش بہا عصائے شاہی۔

اور جب شام کو اپنے گھر واپس آتا ہوں، تو پھر اُسی کلام کو پاتا ہوں، جسے میں نے صبح کو سانپوں کی طرح رینگتے اور بچھوؤں کی طرح ڈنک مارتے دیکھا تھا۔

کلام فضا میں اور فضا کے پیچھے ہے، زمین پر اور زمین کے نیچے ہے۔

کلام ایتھر کے بازوؤں پر ہے، سمندر کی موجوں میں ہی، جنگلوں اور غاروں میں ہی، پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہے۔

کلام ہر جگہ ہے! تو پھر سکون و اطمینان کا متلاشی کہاں جائے؟

کیا اس دنیا میں کوئی گونگوں کی جماعت ہے کہ میں اس میں شامل ہو جایا کروں؟

کیا اللہ از روئے کرم، مجھے گراں گوشی کے عطیہ سے نواز سکتا ہے کہ میں ابدی سکون کی جنت میں کامیاب، زندگی بسر کروں؟

کیا اس وسیع و عریض کرۂ ارض پر ایک گوشہ بھی ایسا نہیں، جو زبان کی بکواس سے خالی ہو، جہاں کلام فروخت کیا جاتا ہو، نہ خریدا جاتا ہو، عطا کیا جاتا ہو، نہ قبول کیا جاتا ہو؟

کاش! میں جانتا کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہی، جو از راہِ کلام اپنے نفس کو نہیں پوجتا!!

کاش مجھے معلوم ہوتا کہ خاک دانِ ہستی میں ایک انسانی جماعت ایسی بھی ہے، جس کا منہ، الفاظ کے ڈاکوؤں کا غار نہیں ہے!!

اگر بولنے والوں کی صرف ایک قسم ہوتی تو ہم مطئین ہو جاتے اور ہمیں صبر آجاتا، لیکن ان کی قسمیں تو اتنی ہیں کہ شمار نہیں کی جا سکتیں۔

چنانچہ ایک جماعت تو اُن "مینڈکوں" کی ہے جو سارے دن جوہڑ ول میں پڑے رہتے ہیں اور جب شام ہوتی ہے تو کنارے پر آکر اپنا سر پانی سے نکال لیتے ہیں اور رات کے سینے کو اپنی اس ٹرٹر سے گراں بار کر دیتے ہیں، جسے سننے سے کانوں کے پردے پھٹنے لگتے ہیں اور روحیں بے چین ہو جاتی ہیں۔

اور ایک جماعت اُن "مچھروں" کی ہے (اور مچھر بھی جوہڑ کی پیداوار ہیں) جو تمہارے کانوں کے گرد بھنبھناتے ہیں، ان کی پر شور مگر حقیر شیطانی بھنبھناہٹ وہ ہے جسے آزاد رسانی کے جذبہ نے پیدا کیا ہے اور شدید نفرت نے پروان چڑھایا ہے۔

اور ایک جماعت اُن "پسنہاروں" کی ہے (اور یہ عجیب و غریب جماعت ہے) جن میں سے ہر شخص کے باطن میں ایک پتھر ہوتا ہے، جس کو گردش دیجاتی ہے تو اس سے ایک ایسی جنبی گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی ہے کہ اس کی ہلکی سے ہلکی آواز چکّی کے پاٹوں کی گڑگڑاہٹ سے زیادہ بھاری ہوتی ہے

اور ایک جماعت اُن "بیلوں" کی ہے جو اپنا پیٹ چارہ سے بھر کر گلیوں اور سڑکوں کے موڑ پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور فضا کو اپنی اُن ڈکاروں سے گراں بار کرنا شروع کر دیتے ہیں، جو اگرانتہائی لطیف بھی ہوں، تو بھینس کی ڈکار سے زیادہ ناگوار ہوتی ہیں۔

اور ایک جماعت اُن "اُلوؤں" کی ہے جو اپنے اوقات ویرانوں اور قبروں میں گذارتے ہیں اور تاریکی کے سکون و سکوت کو اُس چیخ پکار سے بدل دیتے ہیں جس کا خوشگوار حصہ اُلو کی آواز سے زیادہ غم آفریں ہوتا ہے۔

اور ایک جماعت اُن "آرہ کشوں" کی ہے، جنھیں زندگی لکڑی کے ناتراشیدہ ٹکڑوں کی شکل میں نظر آتی ہے اور وہ اپنی ساری عمران ٹکڑوں کے کاٹنے اور چھیلنے میں گذار دیتے ہیں۔ ان کی اس حرکت سے ایک عجیب سی کھرکھراہٹ پیدا ہوتی ہے، جو اگر حد درجہ شیریں بھی ہو، تو آروں کی کھرکھراہٹ سے زیادہ مکروہ ہوتی ہے۔

اور ایک جماعت اُن "ڈھول پیٹنے والوں" کی ہے، جو اپنی روحوں کو بڑی بڑی موگریوں سے پیٹتے ہیں، اور اُن کے خالی مُنہ سے ایک ایسا

شور بلند ہوتا ہے جو اگر بہت ہلکا ہوتا ہے تو ڈھول کی آواز سے زیادہ پریشان کن ہوتا ہے۔

اور ایک جماعت اُن "چاٹنے والوں" کی ہے جن کے لئے کوئی کام اور کوئی شغل نہیں، سوائے اس کے کہ جہاں جگہ دیکھیں، بیٹھ جائیں۔ یہ لوگ بات کو چباتے تو بہت ہیں لیکن ادا نہیں کر سکتے۔

اور ایک جماعت "اُن مذاق اُڑانے والوں" کی ہے جو لوگوں کی غیبت کرتے ہیں، آپس میں ایک دوسرے کی غیبت کرتے ہیں، بلکہ غیر شعوری طور پر آپ اپنی غیبت کرتے ہیں۔ اور اس "غیبت" کو کہتے ہیں ظرافت۔ حالانکہ ظرافت سنجیدگی کی ایک قسم ہے۔ لیکن وہ اس کو نہیں جانتے۔

اور ایک جماعت اُن "جلاہوں" کی ہے، جو ہوا کو ہوا سے بنتے ہیں لیکن وہ عریاں کی عریاں ہی رہتی ہے۔

اور ایک جماعت اُن "میناؤں" کی ہے، جن کے متعلق ایک شاعر کہتا ہے "جب اُڑنے والا اُڑا، تو میں یہ سمجھا کہ وہ شاہین ہو گیا"!

اور ایک جماعت اُن "گھنٹوں" کی ہے، جو لوگوں کو تو عبادتگاہوں کی طرف بلاتے ہیں، لیکن خود ان میں داخل نہیں ہوتے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی جماعتیں اور گروہ ہیں۔ جو ہنوز شمار و تعریف کی حدود سے باہر ہیں۔ میرے خیال میں ان غیر معروف جماعتوں میں سب سے زیادہ عجیب اُن سونے والوں کی جماعت ہے، جنھوں نے اپنے خراٹوں سے فضا میں ہنگامہ برپا کر رکھا ہے، لیکن خود اس سے بے خبر ہیں۔

میں کس سے محبت کرتا ہوں

میں انتہا پسندوں سے محبت کرتا ہوں۔

اُن لوگوں سے محبت کرتا ہوں، جو زندگی کے سمندر کی گہرائیوں میں اُترتے اور زندگی کی بلندیوں پر چڑھنے کی قدرت رکھتے ہیں!

اُن لوگوں سے محبت کرتا ہوں، جو کلیتہً اشیاء کی یکتائی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور دو متضاد چیزوں کے درمیان کبھی سرگشتہ و فکرمند کھڑے نہیں ہوتے!

اُن لوگوں سے محبت کرتا ہوں، جو قوی اور مستحکم ارادوں سے بھرپور ہیں اور اُن بسیط روحوں کی تمنا کرتا ہوں، جو "ترکیب" کو بالطبع قبول نہیں کرتیں اور "تقسیم" جن کے جوہر کے پاس تک نہیں پھٹک سکتی۔

میں اُن دلیر انتہا پسندوں سے محبت کرتا ہوں، جو اپنے شوق و آرزو کی آگ میں جلتے ہیں، اپنے دلوں کے وجدان سے بیچین ہیں۔ اپنے جذبات کی اطاعت کرتے ہیں، اُصولوں کے میدان کارزار سے ہٹ کر "اصل اصول" کو اپنا مرکز قرار دیتے ہیں، اختلاف افکار سے روگرداں ہو کر اپنا رخ اُس

مجرّد اور راقلیں فکر کی طرف کر لیتے ہیں یہ اُنہیں بادلوں سے پرے بھی اُڑا لے جاتی ہے، اور سمندر کی گہرائیوں میں بھی اُتار دیتی ہے۔

میں اعتدال پسندوں کو جانتا ہوں، میں نے اُن کے ارادوں کو تولا ہے، اُن کی کوششوں کو جانچا ہے، اور اُنہیں بزدل پایا ہے جو بادشاہ کی شکل میں "حق" سے اور شیطان کی صورت میں "باطل" سے ڈرتے ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے عقائد و قواعد کے اُن درمیانی حلقوں میں پناہ لے لی ہے جو نہ مفید ہیں، نہ مضر، اور اُن آسان راہوں پر چلنے لگے ہیں، جو اُنہیں سنسان جنگلوں میں لے جاتی ہیں —— ان سنسان جنگلوں میں، جو ہدایتوں اور گمراہیوں سے خالی ہیں جہاں کامیابیوں اور ناکامیوں کا عالم زندگی موسم گرما ہے، جس کی تمناؤں اور آرزوؤں کے سمندر متر نم ہوتے ہیں، اور موسم سرما ہے، جو اپنی آندھیوں کے ہلاکت خیزیوں کے سبب تابناک ہے، اس لئے جو کوئی اپنی زندگی کو گرمیوں کے خمار اور جاڑوں کی دہشت سے محفوظ رکھنے کے لئے، اُسے مختلف حصّوں میں تقسیم کرنے میں اعتدال سے کام لیتا ہے، اُس کے دن جلال و جمال سے خالی اور اس کی راتیں افسانہ و خواب سے محروم ہو جاتی ہیں اور خود زندوں کے مقابلہ میں مُردوں سے قریب تر ہو جاتا ہے، یہی نہیں بلکہ اُن "قبریار" انسانوں میں سے ہو جاتا ہے، جو زمین کے بطن میں سونے کے لئے مرتے ہیں۔ نہ سورج کی روشنی میں چلنے پھرنے کے لئے تندرست ہوتے ہیں۔

جو کوئی دین میں اعتدال سے کام لیتا ہے، وہ سزا کے خوف اور جزا کی خواہش کے درمیان حیرانی و سرگشتگی کے عالم میں کھڑا رہتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی اہل ایمان کے جلوس کے ساتھ چلتا ہے، لکڑی کے سہارے چلتا ہے، اور جب کبھی بحالت نماز رکوع میں جاتا ہے، تو اُس کی فکر اُس کے سامنے کھڑی ہو کر اُس کا مذاق اڑاتی ہے۔

اور جو کوئی دنیا میں اعتدال سے کام لیتا ہے، وہ مدت العمر وہیں رہتا ہے، جہاں پیدا ہوا تھا، وہ نہ پیچھے ہٹتا ہے کہ لوگ اُس کی رجعت سے سبق حاصل کریں، نہ آگے قدم بڑھاتا ہے کہ دنیا کو راہ راست دکھائے یا اپنے کارناموں سے اُس کی تربیت کرے، بلکہ حیران اور بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے، اپنے سائے پر نگاہیں جمائے، اپنے دل کی دھڑکنوں پر کان لگائے اور اپنے انفاس کا گلا گھونٹے۔

اور جو کوئی محبت میں اعتدال سے کام لیتا ہے، وہ اس کے شفاف پیالوں سے سرد و شیریں شربت پیتا ہے، نہ گرم و تلخ شراب، بلکہ اُس کے ہونٹ اُس گنگنے پانی کے قطروں سے تر رہتے ہیں، جنہیں جہالت، کمزوری اور خوف کے جوہڑوں سے بہتی ہے۔

اور جو کوئی شر کی مدافعت اور خیر کی اعانت میں اعتدال سے کام لیتا ہے وہ شر کو شکست دے سکتا ہے، نہ خیر کی امداد کر سکتا ہے، وہ صرف اسی پر اکتفا کرتا ہے، کہ پگھلے ہوئے جذبات کے ارد گرد، منجمد جذبات کی دیوار کھینچ لے، چنانچہ وہ اپنی ساری عمر خواہشوں کے ساحل پر بسر کر دیتا ہے بسبب

کی طرح اُس کا ظاہر، پتھر کی مانند سخت اور باطن، غلیظ رطوبتوں سے پُر ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ زندگی کے سمندر کا چڑھاؤ کب ختم اور اُتار کب شروع ہوگا؟

اور جو کوئی عظمتوں کی طلب میں اعتدال سے کام لیتا ہے، وہ اُس تک کبھی نہیں پہنچ سکتا، وہ عظمت و بزرگی کی روح کے نکھار کی طرف دھیان نہیں دیتا بلکہ اُن کی ظاہری سطح پر سونے کا چمک دار پانی چڑھا دیتا ہے، جو کبھی خشک نہیں ہوتا، یہاں تک کہ ہوا کا ایک جھونکا یا روشنی کی ایک شعاع اُسے فنا کر دیتی ہے۔

اور جو کوئی آزادی کے پیچھے دوڑنے میں اعتدال سے کام لیتا ہے وہ ٹیلوں اور دیواروں میں اس کے نقوش قدم کے سوا اور کچھ نہیں دیکھ سکتا اس لئے کہ آزادی زندگی کی مانند ہے، جو لنگڑوں اور پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے والوں کے لئے اپنی رفتار سست نہیں کرتی۔

اور جو کوئی خواہشوں میں اعتدال سے کام لیتا ہے، وہ بلند و طویل یا نظر فریب و کوتاہ زندگی کا طالب ہوتا ہے، لیکن اس کے ارادہ کے خلاف اُسے طویل و بے رنگ یا کوتاہ و بے کیف زندگی نصیب ہوتی ہے اور اگر وہ انتہا پسندوں میں سے ہوتا، تو کامیابی و کامرانی کا دامن اُس کی زندگی کے ہاتھ میں ہوتا اور وہ حق، محبت اور آزادی سے ہمکنار رہتی۔

میں نے درماندہ اعتدال پسندوں کو کہتے سنا:

"قناعت وہ خزانہ ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوتا!"

تو میری روح نے ایک بیزاری سی محسوس کی اور یہ کہکر اس سے دور ہوگئی۔

"بندر، انسان اور پالیتے ذبو کس طرح بن سکتے ہیں، جبکہ وہ اپنی پستی و کم قدری پر قانع ہیں" اور میں نے بندروں اور باشندوں کو کہتے سنا:

"اعتدال فضیلتوں کا سر ہے!"

تو میری روح گھبرا گئی اور یہ کہکر اس نے اپنا منہ اُن کی طرف سے پھیر لیا۔

"کیا یہ مخلوق اشیا کی حقیقت کا ادراک کر سکتی ہے، جبکہ وہ اُن کے درمیانی نقطوں پر نگاہیں جمائے ہوئے ہے؟ کیا حیوانات کی طرح اشیا کا بھی سر اور دم نہیں ہوتی؟"

میں نے مفلوج عقل والوں کو کہتے سنا:

"تیرے ہاتھ میں ایک چڑیا شاخ پر دس چڑیوں سے بہتر ہے!"

تو میری روح مضطرب ہوگئی اور غصہ سے کہنے لگی:

یہ کاہل آدمی چڑیا پانے کے بھی مستحق نہیں ہیں، جب تک دس چڑیوں کے پیچھے دوڑنے کے لئے اپنی ٹانگوں کو زحمت نہ دیں۔ کیا اُڑتے ہوئے پرندوں کے جھنڈ کے پیچھے دوڑنا زندگی کی راہ میں جد وجہد نہیں ہے،

بلکہ زندگی کا مقصد نہیں ہے، بلکہ خود زندگی نہیں ہے؟"

میں انتہا پسندوں سے محبت کرتا ہوں۔

میں اُس سے محبت کرتا ہوں، جسے اعتدال پرستوں نے سولی پر چڑھایا اور جب اس کا منکا ڈھل گیا اور اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں تو ایک دوسرے سے کہنے لگے:-

"آج ہم نے اس آزار رساں انتہا پسند سے چھٹکارا پالیا!"

لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کی روح اُسی لمحہ نسلوں اور قوموں کو مغلوب کرتی ہوئی چلی گئی!

میں اُس سے محبت کرتا ہوں، جس نے اپنے باپ کی شان و شوکت پر لات ماری اور ریشمی لباس کے بدلے گدڑی اور رفعت کے بدلے ذلت قبول کرکے، اُس مرکز کی طرف تنہا روانہ ہوگیا، جو الہام و وحی کا سرچشمہ ہے، اعتدال پرست اس کا مذاق اُڑاتے اور اُس کے اس فعل پر حیرت کا اظہار کرتے رہے، لیکن اس کی نازک اور باریک اُنگلیاں وجود کے ظاہر و مخفی پہلوؤں کو جمع کرتی رہیں۔

میں اُن شہیدوں سے محبت کرتا ہوں، جو موت کی آرزو میں کرتے ہیں، "انتہائی مقصد" کے سوا ہر چیز کو ارزاں خیال کرتے ہیں اور "بلند عزم" کے سوا ہر شے کو حقیر سمجھتے ہیں۔

میں اُن لوگوں سے محبت کرتا ہوں، جو آگ میں جلائے گئے، سنگسار

کٹے گئے، پھانسی پر لٹکائے گئے، تلوار کے گھاٹ اتارے گئے، اس "فکر" کی بنا پر، جس نے ان کی عقلوں کو اپنا لیا تھا........

.......، یا اس جذبہ کی بنا پر، جس نے ان کے دلوں کو بھڑکا دیا تھا۔

میں انتہا پسندوں سے محبت کرتا ہوں، چنانچہ جب کبھی میں نے پیالہ اپنے ہونٹوں سے لگایا ان کے آنسو اور خوف کا مزہ چکھا، جب کبھی اپنی کھڑکی میں سے فضا کی طرف نگاہ کی، ان کے تابناک چہرے دیکھے اور جب کبھی آندھی پر کان لگائے، ان کے خوشی کے ترانے اور مسرتوں کے گیت سُنے!

ق

اے فن! جو اپنی تاثیر کی بنا پر عظیم، اپنے کارناموں کی بنا پر عجیب اور اپنے جمال و اسرار کی بنا پر بلند ہے! تو ایجاد پسند فن کاروں کے ذہن میں ازلی موجد کے کمالات قدرت کی ایک پرچھائیں ہے، ابدیت اور قلبِ انسانی کے درمیان منڈلاتی ہوئی روحِ خداوندی ہے، تو اس عالم میں، جو اپنی حرکت کی بنا پر خوابیدہ اور اپنی رفتار کی بنا پر جامد ہے، ایک بیدار فکر ہے!
اپنی ننھی انگلیوں سے تو عناصر کو جمع کرتی اور ان سے ایسی ایسی تصویریں اور پرچھائیاں بناتی ہے، ایسے ایسے اجسام اور نغمے پیدا کرتی ہے، جو زمانہ کے ساتھ باقی رہتے ہیں، جن کا حسن ابدالآباد تک زائل نہیں ہوتا۔

"عدم جب تیرے سامنے سے گذرتا ہے تو "وجود" ہو جاتا ہے "لاشے" جب تیرے دامن کو مس کرتا ہے تو "شے" کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور موت جب تیرے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو "زندگی" سے بدل جاتی ہے، تمام آوازیں، رنگ اور خطوط، تمام عناصر، ارواح اور سائے اور ہر وہ چیز جسے فطرت اپنی حرکت اور

انسان اپنے وجود سے پیدا کرتا ہے، تیری مرضی کے آگے سپر انداز ہیں، تیرے وجود سے وجود پذیر ہوتے ہیں، اور تیری خواہش کے مطابق جنبش میں آتے ہیں۔

تو زمانہ کو مس کرتا ہے اور زمانہ پتھر کی شکل اختیار کر کے اُن مورتیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے، جو ابدیت کے مقابل کھڑی ہیں۔ تو ہوا میں سانس لیتا ہے۔ اور تیرے نغمہ کار ہونٹوں اور آہنگ آفریں انگلیوں سے ایک آسمانی شراب، ہوا میں بکھر جاتی ہے، تو ذرات نور میں مرتعش ہوتا ہے اور کتابوں کے صفحات پر سیاہی کے ساتھ روشنی جگمگانے لگتی ہے تو شفق کی شعاعوں اور قوس قزح کے رنگوں کو جمع کرتا ہے اور اس سے عجیب عجیب تصویریں اور نقش و نگار بناتا ہے، تو چٹانوں کو اپنے قدموں سے پامال کرتا ہے۔ اور چٹانیں اُن مندروں، مسجدوں اور ہیکلوں کی صورت میں بلند مرتبہ ہو جاتی ہیں، جن کی بقا مذہب کی بقا سے وابستہ ہے

تیرے تخت کے سامنے قومیں بیدار اور مترنم کھڑی رہتی ہیں، چنانچہ اُن میں سے جو گذر چکی ہیں، وہ تیری موجودگی کے سبب موجود ہیں۔ اور جو آنیوالی ہیں وہ اس وقت بھی تیرے دامن کے گرد طواف کر رہی ہیں۔

قوموں کی عظمت اُسی وقت تک باقی رہتی ہے، جب تک تو باقی رہے اور اُسی وقت فنا ہو جاتی ہے، جب تو زائل ہو جائے۔ اس لئے،

کہ قوموں کی زندگی میں تیرا وہی درجہ ہے، جو درجہ جسم میں دل کا ہے، چنانچہ مصر۔ آشور اور ایران آسمان کی بلندیوں تک نہیں پہنچے، جب تک تو اُس کے قریب نہ ہوا، اور ذلت و پستی کے غار میں نہیں گرے جب تک تو نے اُس سے دوری اختیار نہ کی۔ افریقہ، روم، اور قسطنطنیہ روشنی سے ہم کنار نہیں ہوئے جب تک تیرے سائے میں نہ آگئے اور تاریکی کے لحافوں میں نہیں سوئے جب تک تو نے اُنہیں نہ چھوڑا۔

اور آج جبکہ زمانہ نے اُن قوموں کی عظمت و جبروت کو مٹا دیا ہے، ناممکن ہے کہ اُن کے آثار سے تیرے نقوشِ قدم کو محو کر دے، اُس طلسمی نقاب کے بچے کھچے ٹکڑوں کو چاک کر دے، جو تو نے اُن قوموں کے باقی رہنے والے کارناموں پر ڈالی تھی چنانچہ نیل کے ساحل پر چلنے والا محلوں اور ہیکلوں میں تیری پرچھائیوں کو منڈلاتے دیکھتا ہے۔ اکرا اور بلبیس[1] پر بیٹھنے والا تیرے سانس کے شعلوں کو ستونوں اور مورتیوں پر ناوے کاٹتے دیکھتا ہے اور اسپارٹا، تدمر اور بعلبک کے کھنڈروں کی دیواروں کو دیکھنے والا اُن نظموں کے مطلع اور قصیدوں کے مقطعے پڑھتا ہے۔ جو تیری انگلیوں نے رقم کئے تھے۔

اگر تاریخ زمانہ کا آئینہ ہے، تو تو وہ ہاتھ ہے، جس نے اس آئینہ کی سطح کو صیقل کے ذریعہ مجلا کیا۔ اگر علم وہ زینہ ہے جو انسان کو ستاروں سے آگے

[1] ایتھنز کا ایک قلعہ، جو خوش آثار و عظیم الشان ہیکلوں میں سے ایک ہے ۱۲

والے جہانوں میں پہنچاتا ہے، تو تو وہ عزم ہے جس نے اس زینہ کی سیڑھیاں بنائیں اور اُن کی حفاظت کی اور اگر مذہب "شعرِ حیات" ہے، تو، تو وہ وزن ہے جس نے اس شعر کو سینوں کے لئے ایک آہنگ اور دلوں کے لئے ایک نغمہ بنایا۔

اے فن! جو اپنے اسرار کی بنا پر انوکھا، اپنے رموز کی بنا پر عجیب و غریب اپنی رفعت کی بنا پر قوی اور اپنی غیر معمولی عظمت و جلالت کی بنا پر دلکش و نظر فریب ہے، ہم تیرا وصف کس طرح بیان کریں اور کس چیز سے تجھے تشبیہہ دیں؟ جبکہ تو خود ہی وصف کی روح اور تشبیہہ کی علت ہے! کیا ہم تجھے جذبہ کے نام سے تعبیر کریں جبکہ تو خود احساس و جذبات کا سرچشمہ ہے! یا قوت کے نام سے پکاریں؟ جبکہ تو خود قوتوں اور ارادوں کا مظہر ہے! ہم تیری زرگی کو دل کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، تیرے ترانوں کو اپنے نفس کے کانوں سے سنتے ہیں۔ اور تیرے دامن کو اپنی روح کے مرتعش ہونٹوں سے چومتے ہیں۔ لیکن ہم تیرے نام کے حرفوں میں سے ایک حرف بھی نہیں لکھ سکتے جب تک ہماری انگلیاں تیری انگلیوں سے مس نہ کریں اور تیرے جمال کے متعلق ایک لفظ نہیں کہہ سکتے۔ جب تک ہماری زبانیں تیرے حسن کی شراب میں ڈوب نہ جائیں تو اپنا مظہر آپ ہے اور ہم اُس محبت کی قوت کے ذریعہ، جو تو نے ہماری گہرائیوں میں پیدا کی ہے اہلِ فن کی محبت سے قریب ہوتے ہیں۔

اے فن! مجھے اپنے اُن خادموں میں کا ایک خادم بنا لے جو زندگی پر اپنا اقتدار رکھتے ہیں۔ اپنے اُن سپاہیوں میں کا ایک سپاہی بنا لے،

جو اللہ نے تیری گہرائیوں میں پیدا کی ہے۔

جو زمانہ پر غالب ہیں۔ میری آزادی کو اپنی مشیت کی پرستش کرنے دے اور میری روح کو اپنی شعاع سے مس کر! بہت ممکن ہے اس طرح وہ خود سے اور تجھ سے قریب ہو جائے۔